PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

ناولٹ

کہر میں

نایاب جیلانی

سپر لگژری ''کیمری'' فل اسپیڈ کے ساتھ نیویارک کی کارپٹڈ ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔ سورج کی کرنیں چھتوں پر پڑ رہی تھیں جہاں برف پڑی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا سنہری کرنوں کی چمک سے کئی ہیرے دمک رہے ہوں۔

مگر یہ چمک اس کی آنکھوں میں ریت بھر رہی تھی۔

اگر خالہ اسے اتنا مجبور نہ کرتیں، اس کے سامنے گریہ نہ کرتیں اور مرنے سے پہلے عہد نہ لیتیں تو شاید

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

فاطمہ کبھی ان اجنبی راہوں کی طرف نہ پلٹتی...... ان کٹھور لوگوں کی بستی میں نہ آتی۔ خالہ کی ہر بات پر سر جھکانا اس کا فریضہ تھا۔ خالہ کی محبت اور فرمانبرداری اس کے لیے عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔

خالہ کی یاد میں آج بھی فاطمہ کی آنکھیں نمی سی بھر جاتی تھیں۔ اس کا ویزا لگا اور ٹکٹ کنفرم ہوا ادھر خالہ اپنے آخری ''فرض'' سے فراغت پا کر خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ فاطمہ کے ویزے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس کی زندگی میں در آنے والی طغیانی کے بعد سکون اور شانتی کا انتظار کر رہی تھیں۔ جیسے ہی ماموں نے ایک مرتبہ پھر اس کا ویزا وغیرہ بھیجا...... ٹکٹ کے پیسے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیے...... اُدھر خالہ نے مکان بیچ کر سارے اماؤنٹ کے ڈالرز بنوائے اور فاطمہ کو اپنے آنسوؤں سے زیر کر کے جہاز میں بٹھا دیا...... ابھی وہ سفر میں تھی جب اطلاع ملی کہ خالہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ شاید وہ فاطمہ کو اپنی زندگی میں محفوظ ٹھکانے پر بھیجنے کا اطمینان کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئی تھیں...... یا پھر اپنی بیٹی کا لدا بوجھ اتار کر اللہ کے حضور حاضر ہوئی تھیں۔

انہیں گمان ہوگا...... یہ عمل ان کی بیٹی کے رستوں میں بکھرے کانٹے سمیٹ دے گا۔ شاید خالہ کا گمان غلط نہ ہو...... مگر ہر کوئی اپنے عمل کا کیا پاتا ضرور ہے۔ چاہے کسی بھی صورت میں ہو...... دل دکھانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے اگر کوئی ان کا دل دکھا جائے تو کیا ہو؟ زندگی چھین لینے کی کوشش کرنے والے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ کوئی ان کی زندگی کے ساتھ اس طرح کرے تو کیا ہو...... ؟ بے بس کر دینے والے جب خود بے بس ہو جاتے ہیں تو اپنی بے بسی کا حال تک سنا نہیں سکتے۔

نیویارک ہائی وے پر بکھری ایسی دردناک یادیں آج بھی فاطمہ کی روح کو جھنجوڑتی تھیں۔ جیسے ایک فلم سی تھی جو آنکھوں کے پار چل رہی تھی۔ منظر کے بعد منظر بدل رہا تھا۔ چہرے کے بعد چہرہ بدل رہا تھا۔ آنکھوں کے رنگ بدل رہے تھے۔ لوگ بدل رہے تھے، عکس بدل رہے تھے۔ حتیٰ کہ شہر بدل رہے تھے۔

اچانک چلتی ''کیمری'' کی خاموش فضا میں مردانہ آواز ابھری تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والا بظاہر سنجیدہ نظر آتا بندہ ایک دم بولنا شروع ہوا تو فاطمہ کو خیال آیا۔ وہ گاڑی میں اکیلی نہیں تھی اور سوچوں کے سفر میں بہت دور تک نکلی ہوئی تھی۔ اس کی یادیں نیویارک ...... کی طرح بہت گنجان تھیں۔ پھر بھی وہ لمحہ بھر میں یادوں کے طویل سلسلے کو جھٹک کر سیدھی ہوگئی۔ اس کا دھیان ارد گرد نہیں، امر کی گفتگو اور باتوں کی طرف تھا۔ وہ شاید خود کلامی کر رہا تھا۔ یقیناً یہ امر ہی تھا...... ماہر کا دوست بلکہ جگری دوست، بیچ میں چودہ سال آ چکے تھے پھر بھی فاطمہ نے ائرپورٹ پر امر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میں پہچان لیا تھا۔ تب کے اور اب کے امر میں کافی فرق تھا۔ تب وہ ایک لاابالی، بے فکرا، ہنس مکھ، شوخ مزاج اسٹوڈنٹ تھا۔ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ لیکن اس وقت وہ پہلے والے امر سے کافی مختلف لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ بیچ میں چودہ سال آ گئے تھے۔ گو کہ وہ اب بھی ہینڈسم اور پرفیکٹ تھا مگر اس کی پرسنالٹی سے سنجیدگی میچ نہیں کر رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ وہ مغرب کا پروردہ ضرور تھا لیکن آج بھی مغرب کے لیے اس کے جذبات منفی ہی تھے۔ فاطمہ کو وہ پہلے والا ہی امر لگا...... جب وہ ماموں کے گھر کی مین روڈ پر اونچی آواز میں گوروں کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔

فاطمہ کو اس وقت بھی وہ پہلے والا امر ہی لگا...... ویسا ہی جوشیلا اور بھڑکیلا...... اور اس کا دوست بھلا کیسا ہوگا؟ پہلے کی طرح ہی سرد، برفیلا، اجنبی......

اس کا خیال بھٹک کر ماہر کی طرف لپکنے لگا تھا۔ اس نے خود کو ملامت کر کے ذہن امر کی باتوں اور غصے کی طرف لگایا تھا پھر ایک گہری افسردہ سانس اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

''بڑی طاقتیں ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے ویٹو پاور

کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ پاور بڑی ریاست کی سربراہی سے حاصل ہو...... دولت سے حاصل ہو یا حسن سے...... اپنے مفاد کے لیے بڑی طاقتیں کچھ نہیں دیکھتیں۔ چھوٹے ملکوں اور چھوٹے لوگوں کو کچل کر رکھ دیتی ہیں۔'' فاطمہ کے جواب نے لمحے بھر کے لیے امر کو سن کر کے رکھ دیا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کا ہاتھ ہولے سے کپکپایا تھا۔ جیسے وہ سمجھ گیا تھا۔ فاطمہ کا اشارہ کس طرف تھا اور وہ کن بڑی طاقتوں کا ذکر کر رہی تھی۔

''وقت بڑی طاقتوں کو سرنگوں کر دیتا ہے۔''

کافی دیر بعد امر نے جیسے تبصرہ کیا تھا۔ فاطمہ کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''وقت نہیں...... بڑی طاقتوں کی شاطرانہ چالیں جو کبھی کبھار الٹ بھی جاتی ہیں...... اور کبھی کبھار مات کرنے والوں کو شہ مات کا مزہ بھی چکھنا پڑتا ہے...... اور یہ تقدیر کی شہ مات ہوتی ہے۔'' اس کا لہجہ کسی قدر نم اور افسردہ تھا۔ امر لمحے بھر کے لیے چپ سا ہوگیا۔

''تم بہت سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہو۔'' اس کا انداز ذرا بے تکلف قسم کا تھا۔ تاہم وہ اس کی سنجیدگی پر چونک ضرور گیا تھا۔

''بیچ میں چودہ سال آ چکے ہیں امر بھائی......'' وہ جتانا نہیں چاہتی تھی پھر جانے کیسے زبان سے پھسل گیا۔ امر بھی چپ سا کر گیا۔ اب بھلا کیا بولتا۔ جیسے سارے لفظ بے جان اور بودے ہو چکے ہوں۔

کافی دیر تک کار میں معنی خیز سی خاموشی چھائی رہی۔ جسے امر نے خود ہی سمیٹ ڈالا۔

''سفر تو اچھا گزر گیا......؟'' اسے کچھ تو کہنا ہی تھا یا شاید وہ فاطمہ کے لفظوں کی گھٹن کو زائل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اچانک ہی گفتگو کو ایک الگ موڑ دے دیا تھا۔ شاید اسے بات بدلنے کے لیے بہترین موضوع مل گیا تھا۔

''پتا نہیں ...... ترکی میں جہاز کا اسٹے (وقتی قیام) تھا۔ وہیں پہ خالہ کی وفات کا پتا چلا...... پاکستان سے کال آئی تھی۔'' فاطمہ کی آواز پھر سے بھرّا گئی۔ امر کی آنکھوں میں بھی تاسف ابھرنے لگا...... پھر اس نے قدرے جھجک کر پوچھا تھا۔

''وہ حورعین کی والدہ تھیں نا؟''

''ہاں......'' فاطمہ کے حلق تک میں ریت بھر گئی تھی۔ دریائے ہڈسن کے کناروں پر بکھری سوکھی ریت اڑتی ہوئی اسے غبار آلود کر گئی تھی۔ فاطمہ کا منہ، ناک اور آنکھیں ریت کے نوکیلے ذروں سے بھر گئے تھے۔ اسے لگا حورعین کے نام کے ساتھ ذلتوں کے کئی باب اور کئی اوراق کھلتے چلے گئے تھے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے چکراتا سر تھام لیا تھا۔ امر نے اس کی بگڑتی طبیعت دیکھی اور پریشان ہوگیا۔ پھر اس نے جلدی سے پانی کی بوتل کھول کر اسے پکڑائی۔ وہ خاصا گھبرا گیا تھا۔ گو کہ وہ ایک ڈاکٹر تھا پھر بھی......

''تم ٹھیک ہو فاطمہ......'' اس نے کافی دیر بعد جب وہ کچھ سنبھل گئی تب پوچھا تھا۔

''بہتر ہوں۔'' اسے بہ مشکل ہی بولنا پڑا تھا۔ پانی کی بوند بس حلق میں اتریں تو سوکھا گلا کچھ تر ہوا تھا۔ پھر وہ ذرا سنبھل گئی تھی۔ آخر امر پر کچھ کیوں ظاہر ہونے دیتی؟ گو کہ امر اس کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھا...... ہر اس ذلت سے جو اس نے نیویارک سے سمیٹی تھی...... ہر وہ ٹھوکر اور دھوکا جو اس نے اپنوں سے کھایا تھا۔ امر سب کچھ تو جانتا تھا...... ہر بات، ہر واقعہ، فاطمہ کی زندگی کے ایک، ایک پل سے واقف تھا۔

پھر اس نے امر کا دھیان خود سے ہٹانے کی غرض سے پوچھا۔

''ماموں اور مامی کیسے ہیں؟'' اس کی نارمل آواز گاڑی میں گونجی تو امر نے سکون کی سانس لی۔ ورنہ وہ خاصا پریشان ہوگیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پہلے اسے کسی میڈیکل اسٹیشن پر لے جائے مگر فاطمہ اب کافی بہتر دکھائی دے رہی تھی۔

''انکل اور آنٹی ٹھیک ہیں...... تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' امر نے نرمی سے بتایا اور پھر بیک ویو مرر

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے فاطمہ کے تاثرات دیکھنے چاہے...... وہ اس کے چہرے سے کچھ کھوجنا چاہتا تھا۔ اس نے کسی اور کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟ چلو ماہر کا نہ پوچھتی پھر بھی کم ازکم اسے بچوں کے بارے میں تو ضرور استفسار کرنا چاہیے تھا۔ وہ بچے جو اس کے آنے کی خبر پہ سخت دیوانے ہورہے تھے۔ خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ اتنے پُرجوش تھے اور بہت دن سے اسے ویلکم بولنے کی تیاریاں کررہے تھے۔

''بچے تمہارا بہت شدت سے انتظار کررہے ہیں۔'' امر نے خود ہی ڈھیٹوں کی طرح بتادیا تھا کیونکہ اسے محسوس ہورہا تھا فاطمہ بالکل بھی بچوں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اسے فاطمہ کے سپاٹ تاثرات پہ عجیب سا دکھ ہوا تھا...... کیونکہ بچوں کا خیال، ان کی خوشی، دیوانگی اور فاطمہ کی آمد کے لیے پُرجوش ہونا وہ خود ملاحظہ کرچکا تھا۔

''اگر فاطمہ کے ایسے ہی کٹھور تاثرات رہے تو بچوں کا دل کس قدر ٹوٹ جائے گا۔'' امر کو آنے والے وقت سے خوف سا آیا۔

گوکہ فاطمہ پہلے سے بہت بدل چکی تھی۔ اس کا وہ بچپنا، لاابالیت اور بے وقوفانہ سا تاثر اب کہیں نہیں تھا۔

وہ بہت سنجیدہ ہوچکی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار اور ٹھہراؤ آچکا تھا۔

اور سب سے بڑی بات فاطمہ کو اپنے تاثرات بھی چھپانے آگئے تھے۔ گویا وقت واقعی بہت آگے تک جاچکا تھا۔ اتنا آگے کہ امر کو بھی فاطمہ سے بات کرنے کے لیے بہت دیر تک سوچنا پڑرہا تھا۔ وہ کیسے اور کس طرح سے بچوں کا ذکر چھیڑے؟ وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا جب فاطمہ نے خود ہی خاموشی کو سمیٹ ڈالا۔ شاید وہ اس معنی خیز چپ پر خود ہی اکتا گئی تھی۔

''کیا ماموں نے گھر بدل لیا......؟'' فاطمہ نے شیشے سے پار دریائے ہڈسن کے پل کو دیکھا تھا۔ یہ رستہ ماموں کے گھر کو نہیں جاتا تھا تو پھر یہ لوگ کہاں جارہے تھے؟ اس نے بہت نیچے تک جھانک کر دیکھا تھا۔ بہت دور تک ہڈسن کا پانی بکھر رہا تھا۔ بہت خوب صورت اپارٹمنٹ نمایاں لہروں پر تیرتی سفید بطخوں کے مانند لگ رہی تھیں۔ ہڈسن کے نیلے پانی پر تیرتے بگلے اتنے سفید تھے کہ موتیوں سا گمان ہوتا۔ بہت دور سے سفید نگینے معلوم ہوتے تھے۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''دریا کے اس پار......'' امر نے اپنے تئیں خاصا ہلکا پھلکا جواب دیا تھا جو فاطمہ کو قطعاً ناکافی لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر تفکر کے گہرے احساس کو دبا کر پوچھا۔

''یہاں کیوں آئے ہیں؟'' وہ بے چین ہوگئی تھی...... یہ امر تو وہی تھا۔ چودہ سال پہلے والا...... بے ڈھنگا، بھیجو کہیں، جاتا کہیں تھا...... لینے کسی کو آتا اور لے کسی اور کو جاتا تھا۔

''ہم کہاں آگئے ہیں؟'' ایک جگہ گاڑی رکتے دیکھ کر اس نے پھر پوچھا......

''ہمیں یہاں لنچ کرنا ہے پھر گھر کی طرف نکلنا ہے۔'' امر نے بالآخر لمبا چوڑا پروگرام بتادیا تھا۔ فاطمہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''تو کیا اب بھی مامی، فاطمہ کے لیے ایک وقت کھانا بنانے کا تردد نہیں کرسکتی تھیں؟'' وہ عجیب انداز میں سوچتی رہ گئی تھی...... گوکہ اسے مامی سے کسی بھی قسم کی ہمدردی یا نرماہٹ کی امید نہیں تھی۔ پھر بھی دل کو دھکا سا لگا۔ واقعی کچھ لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ مامی بھی ویسی ہی تھیں مغرور، نخریلی اور فاطمہ کو کم تر سمجھنے والی۔ اسے کوئی ایسی خوش فہمی تو نہیں تھی اور نہ ہی یہ امید تھی کہ مامی اس کا پُرجوش قسم کا استقبال کریں گی پھر بھی دل عجیب انداز میں بھرا گیا تھا۔ اسے ان سنسان، تلخ اور اجڑے دنوں کا خیال آیا تھا جو اس نے مامی کی ہمراہی میں گزارے تھے اور جو اس نے ماموں کے عقوبت خانے میں بتائے تھے۔ وہ دن شاید فاطمہ عمر بھر نہیں بھلا سکتی تھی۔ وہ مہینے، وہ سال کیسے پُراذیت تھے۔ وہ وقت کتنا دردناک تھا...... گزرتا ہی نہیں تھا...... رینگ، رینگ کے چلتا تھا۔

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی تھی۔ پلکیں پپوٹوں سے جڑیں تو دو آنسو خودبخود ٹوٹ کر گالوں پر پھسل گئے تھے۔ وہ گزرے ہوئے ماضی کو یاد نہ کرنے کا عہد کرکے آئی تھی۔ مگر یادیں تو...... ایسے ہی بدعہد ہوتی ہیں تب اچانک امر نے اسے مخاطب کرلیا تھا۔

''تم نے میرے بارے میں پوچھا نہیں...... میں کیا کرتا ہوں؟ شادی کی یا نہیں؟ یعنی تمہاری نگاہ میں میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔'' امر کا انداز قدرے خفگی لیے ہوئے تھا۔ فاطمہ کو چونک کر سنبھلنا پڑا تھا۔ پھر وہ ذرا سی سیدھی ہوئی۔

''میں یہی سوچ رہی تھی۔'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔ امر نے بیک ویو مرر سے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''جھوٹ تمہیں بولنا نہیں آتا۔'' امر کا انداز جتانے والا تھا۔ فاطمہ چپ سی رہ گئی تھی۔

''تو اب بتادیں...... کیا کرتے ہیں آپ......؟'' فاطمہ نے ملائمت سے پوچھا۔ وہ واقعی امر سے یہی سوال کرنا چاہتی تھی...... لیکن ماضی کی تلخ یادوں میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں...... بچے پالتا ہوں...... تمہارے بچے۔'' امر کا انداز صاف جتانے والا تھا۔ فاطمہ کو لمحہ لگا اور وہ زلزلوں کی زد میں آگئی تھی۔ اس کے دماغ کو چکر پھیریاں لگ گئی تھیں۔ ہر چیز جیسے گول، گول گھومتی جارہی تھی۔ اس کے دل کو بھی پنکھ لگ گئے تھے۔ جیسے صفحۂ ہستی پر بھونچال آگیا تھا۔ فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہر طرف ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''تمہارے بچے......''

''تمہارے بچے......''

فاطمہ کو لگا وہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہوسکے گی۔ اس کی ٹانگوں پر لرزہ طاری تھا۔ اس کے پورے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ وہ رعشہ زدہ مریض کی طرح کپکپانے لگی تھی اور وہ کپکپاتی جارہی تھی، تھرتھراتی جارہی تھی۔ اس پر قیامت آرہی تھی۔

''ڈیڑھ سال ہوچکا ہے حورعین کو گئے ہوئے۔ بچے اس سے بہت اٹیچ تھے۔ وہ ٹوٹ سے گئے۔ ان کو سنبھلنے میں اور کچھ نئی حقیقتوں کو قبول کرنے میں بہت وقت لگا تھا۔ پھر جب وہ سنبھل گئے تو تمہیں......'' امر مزید بھی بتارہا تھا۔ شاید اس کا مائنڈ میک اپ کررہا تھا۔ نئی حقیقتوں سے مراد شاید بچوں کو فاطمہ کے متعلق بتانا تھا۔ اور جب بچوں کو پتا چل گیا تو پھر کیا ہوا ہوگا؟ ان کا ردِعمل کیا تھا؟ اپنے باپ کی طرح ہی ظالمانہ، خودغرضانہ اور کٹھور......

فاطمہ کا رواں، رواں کان بن گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں متزلزل تھیں۔ جیسے کہیں تہلکہ مچا ہو...... جیسے کہیں قیامت بپا ہو۔ وہ دل جو چودہ سال سے تھپک، تھپک کر صبر کی لوریوں سے بہل رہا تھا اچانک ہی جنونی ہوگیا۔ بے قابو سا ہوگیا...... بے چین و بے قرار سا ہوگیا۔

وہ انہیں دیکھنے کے لیے مچل گئی، بلک اٹھی...... مضطرب ہوگئی۔ وہ جو لہو کی طرح جسم کے ریشے، ریشے میں رگ، رگ میں دوڑ رہے تھے۔ وہ کہاں تھے؟ وہ کس شہر میں تھے؟ کس نگر میں تھے؟ وہ انہیں کہاں، کہاں تلاشتی؟ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔

فاطمہ کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں روتی رہے۔ گریہ کرے...... بین کرے...... ماتم کرے...... اسے لگا وہ زمانوں سے نہیں آج ہی جدا ہوئے ہیں بلکہ ابھی جدا ہوئے ہیں۔

امر نے مرر سے دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ فاطمہ کے رخسار نمکین پانیوں سے بھیگ رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی اور اس کے اندر ماتم کی صف بپا تھی۔ شاید صبر کی طنابیں ہاتھوں سے چھوٹ چکی تھیں۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ وہ بلند آواز میں چیخنے لگی۔ وہ اپنے بالوں کو نوچنے لگی۔ رخساروں کو پیٹنے لگی۔ اس کے سارے اختیارات کی حدیں آج ٹوٹ گئی تھیں۔

امر بے بسی سے اسے دیکھتا جارہا تھا۔

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

فاطمہ رو، رو کر نڈھال ہوگئی۔ چلا چلا کر اس کا حلق خشک ہوگیا۔ چیخ، چیخ کر وہ تھک چکی تھی۔ برسوں سے بہتے آنسوؤں کی ندیاں بھی سوکھنے لگی تھیں۔

اس کی آنکھیں سوج کر پھول گئیں۔ کچنن کے پھل کی طرح لال ہوگئیں۔ وہ جس اذیت سے گزر رہی تھی اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ کسی میں اتنی سکت نہیں تھی۔ اتنی طاقت نہیں تھی کہ فاطمہ کا دکھا ہوا زخمی دل چیر کر دیکھ پاتا۔

وہاں لہو ہی لہو تھا، زخم ہی زخم تھے۔

''اور انہیں اتنے سالوں بعد پتا چلا کہ حورعین کون تھی؟ اور تم کون؟ گو کہ بچوں کے معصوم ذہنوں کو الجھانا غیر مناسب تھا پھر بھی ہمیں بتانا تو تھا ہی...... میں نے انہیں سب کچھ بتایا...... اس انداز میں کہ بچوں کی نفسیات کسی بھی موڑ پر نہ الجھے...... ان کے لیے حورعین بھی ڈریم لینڈ کی فیری تھی اور تم بھی...... ڈریم لینڈ کی ایک فیری چلی گئی اور دوسری فیری آگئی...... یعنی تم...... اگر تم واپس پلٹ کر آئی ہو تو یقیناً بہت کچھ درگزر کروگی...... اپنے لیے نہ سہی، ماہر اور انکل، آنٹی کے لیے سہی...... عون اور محمد کے لیے...... وہ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ فلوریڈا کی پرنسز پاکستان سے واپس لوٹ آئی ہے ہم سب کے لیے...... جو تمہارے اپنے ہیں۔''

امر کی آواز کسی آکٹوپس کی طرح اسے جکڑ رہی تھی۔ اس میٹھے لہجے میں آس بول رہی تھی۔ امید چمک رہی تھی۔ وہ یقین تھا جو ٹوٹنے لگتا بھی تو جڑ جاتا۔

اور امر کو واقعی ایسا ہی یقینِ کامل تھا۔ وہ عون اور محمد کی ماں تھی...... اور مائیں کٹھور دل نہیں ہوتیں۔

مائیں کبھی بچوں سے انتقام نہیں لیتیں۔ اور نہ اپنے بچوں کو آزماتی ہیں۔

اور وہ فاطمہ احسن...... ماہر ارباب کی بیوی نہیں...... عون و محمد کی ماں بن کر واپس آرہی تھی کیونکہ فاطمہ احسن صرف عون اور محمد کی ماں تھی...... صرف عون اور محمد کی۔

☆☆☆

اور پھر نیویارک شہر میں اس روز کا چمکتا سورج ڈھل گیا تھا۔ رینگتی ہوئی رات آئی اور ہر چیز پر چھا گئی۔ یہ پچیس دسمبر کی تاریخ تھی، کرسمس کی رات چمکتی روشنیوں نے پورے نیویارک کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ پورا شہر جگمگا رہا تھا۔ پورا شہر گویا جگنوؤں سے بھرا تھا۔ پورا نیویارک دلہن کی طرح سج رہا تھا۔ شاید گوروں کے لیے کرسمس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ ہو۔ فاطمہ کے لیے تو عید سے بھی اوپر جہانوں کی خوشیاں بے دریغ آسمانوں سے برس رہی تھیں۔

وہ رات جو شبِ برات سے کم نہیں تھی...... وہ رات جو ملن کی رات تھی۔ اس رات فاطمہ کی بلکتی ممتا کو قرار آگیا تھا۔ اس رات فاطمہ کی بے سکون زندگی میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ اس نے ان دو لڑکوں کو دیکھا...... جو اس کے شانوں سے کچھ نیچے تھے۔ پھر بھی اپنی عمر سے بڑے قد...... اونچی اٹھان، صحت مند سراپا لیے ذہین آنکھیں۔ فاطمہ کے دل میں ممتا کی ایسی لہریں اٹھیں جو چودہ سال کے ہر دکھ، ہر اذیت ہر جدائی کو بہا کر لے گئیں۔ یاد رہا تو بس اتنا...... ان دو لڑکوں کے وجود میں فاطمہ کے لیے امان ہے، سکون ہے، سرور ہے، خوشی ہے، عمر بھر کا قرار ہے۔

وہ عون اور محمد کو آنکھوں میں بسا، بسا کر نہیں تھک رہی تھی۔ وہ بھی ایسے بلک، بلک کر ملے کہ عمر بھر کی ساری وحشتوں کا ازالہ ہوگیا تھا۔ ان دونوں کے خوب صورت وجود میں گم ہو کر وہ ماموں، مامی کو یکسر نظر انداز کرچکی تھی۔ امر کے بتانے بلکہ جتلانے پر اسے احساس ہوا تھا سو قدرے سنجیدگی سے ماموں اور مامی کو سلام کیا...... گو کہ اس کا انداز کافی روکھا تھا پھر بھی مامی کا جوش کم نہیں ہوا...... وہ بڑی محبت جتلاتے جوش سے فاطمہ سے بھینچ، بھینچ کر ملی تھیں۔ جیسے مامی کے ساتھ فاطمہ کے بڑے اچھے تعلقات رہے ہوں۔ اپنے بیٹے کی ہر زیادتی کا اسے فون کر کر کے اور احوال پوچھ پوچھ کے ازالہ کیا تھا۔

فاطمہ کے دل میں انی سی اتر آئی تھی۔ چاہے کچھ

بھی ہو جاتا...... مامی اور ان کے بیٹے کی دی گئی ذلت کو اتنی آسانی کے ساتھ بھلا دینا ممکن نہیں تھا۔

وہ کیسے بھول جاتی، دن رات کی اس اذیت کو ماہر کے تلخ رویے کو، حقارت کو، مامی کی بیزاری کو اور اس آخری رسوائی کو...... کیا وہ سب کچھ بھلا دینا واقعی آسان تھا۔

ماموں اسے تڑپ، تڑپ کر روتے دیکھ کر پشیمان اور آزردہ ہو رہے تھے۔

''میری بٹی! مجھے معاف کردو...... میں تمہارا کوئی حق ادا نہیں کرسکا......'' وہ اس کا سر تھپکتے بہت غم زدہ تھے۔ فاطمہ کو سنبھلنا ہی پڑا۔ آخر اس کی خرابیٔ قسمت میں ماموں کا کیا دوش تھا...... وہ تو اپنا فرض حتیٰ المقدور نبھاتے ہی رہے تھے جہاں تک ممکن ہوا، فاطمہ سے رابطہ رکھا...... تعلق نبھایا...... اسے تسلی دلاسا دیتے رہے...... ماموں بس اتنا ہی تو کرسکتے تھے۔

''مجھے یقین نہیں آرہا...... میں زندگی میں...... بقائمی ہوش و حواس کے ساتھ عون اور محمد کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا......'' وہ اپنے بیٹوں کو خود میں بھینچ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ فاطمہ نے اتنے سال اسی نفرت میں گزارے کہ یہ دونوں اپنے باپ کی طرح ہوں گے۔ ویسے ہی سنگ دل، کٹھور، خود غرض پھر وہ کیوں خود سے اپنے بچوں کے ساتھ رابطہ کرتی...... ان سے ملتی...... وہ اس گمان میں رہی کہ خود غرض باپ کے بیٹے بھی خود غرض ہوں گے۔

لیکن فاطمہ کا یہ گمان غلط ثابت ہوگیا تھا...... وہ ناک نقشے میں اپنے باپ جیسے ضرور تھے مگر عادتوں، مزاج اور طبیعت میں فاطمہ کا دوسرا عکس......

پھر بہت دیر بعد امر نے ملن کے طویل ہوتے پروگرام کو دیکھ کر فاطمہ سے کہا۔

''فاطمہ! ان سے ملو یہ حمنہ ہیں...... عون اور محمد کی بہن......'' امر کے احساس دلانے پر فاطمہ نے گردن موڑ کر کراسنگ ایریا کے انٹرس پر ابھی تک کھڑی اس

بابا جان ہم ادھورے ہیں بہت

زندگی اِک بے اعتبار شے ہے کسی کو خبر نہیں آنے والا وقت ہمارے لیے خوشیوں کی نوید لا رہا ہے یا غموں کا طوفانی ریلہ...... اپنوں کے بچھڑ جانے کا دکھ صرف چند لمحوں کا رونا نہیں یہ تو عمر بھر کا رونا ہے۔ خوشیوں کا موقع ہو یا غموں کے لمحات اپنے بچھڑے ہوئے بہت یاد آتے ہیں۔

12 اپریل اِک قیامت صغریٰ کا منظر، آسمان کیسا کیسا عجب رنگ دکھاتا ہے یا زمین کیسے دہلتی ہے اس دن سمجھ آئی۔ اچانک بالکل اچانک میرے بابا ہم سے بچھڑ گئے۔ جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں مگر اچھے لوگ کبھی بھلائے نہیں جاتے۔ میرے بابا تھے بھی ایسے ناقابلِ فراموش...... ہر اپنے پرائے کے مددگار اور سہارا، با اخلاق، نڈر، بے باک اور بے خوف، تن تنہا اپنے حاسدوں اور دشمنوں کے سامنے سینہ سپر رہنے والے۔ ہمیشہ ہمیں حق بات کہنے کی نصیحت کرنے والے۔ آج ہم بہن بھائی جس مقام پر ہیں وہ والدین کی ہی دعائیں اور محنت ہیں۔ ہم بیٹیوں کو کبھی بابا نے بیٹوں سے کم نہیں سمجھا۔ بلکہ ہمیشہ فوقیت دی۔ امی سے اکثر باتیں چھپا جاتی تھیں ہم بہنیں مگر بابا کو اپنی جگہ صورتِ حال سے آگاہ کردیتے تھے ہم بیٹیوں کو جو مان، اعتبار بابا نے دیا میری دعا ہے کہ وہ مان، اعتبار، محبت ہم سدا قائم رکھ سکیں۔ میگزین میں میرا لکھا ہوا جب بھی پبلش ہوتا خوشی و مسرت سے ان کا چہرہ دمک جاتا تھا میرا نام پڑھ کر...... ہر ماہ باقاعدگی سے میرے خطوط ارسال کرتے۔ مجھے خود میگزین لا کر دیتے۔ ہمارا معاشرہ وہ معاشرہ جہاں ڈائجسٹوں کو پڑھنا حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جہاں بیٹیاں پڑھی لکھی ہونا فضول خیال کیا جاتا ہے ایسے معاشرے کا مقابلہ کرنے والے میرے بابا اپنی ذات میں منفرد ایسے ہی منفرد تھے اپنی تمام فیملی سے یکسر مختلف اور جیسا ہم اولاد کو چاہا امی کی تربیت خاص کی وجہ سے ہم بھی ویسے ہی سامنے آئے میری کتاب اثاثۂ زیست کی اشاعت کے سلسلے میں بابا نے مجھے بہت سپورٹ کیا تھا اور ان کی خوشی دیدنی تھی۔

ہر اِک کو خوشی سے بطورِ تحفہ دیتے کہ یہ میری بیٹی نے لکھی ہے اور ہر اِک حیران کہ ایسے معاشرے میں اتنی کم عمری میں اتنی پختہ شاعری کیسے ممکن......

بابا جان ہمارے درمیان نہ ہو کر بھی ہمیشہ حیات رہیں گے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے بابا کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں اور دعا کریں اللہ پاک ہم اولاد کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

طلبگارِ دعا، سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خان پور ہزارہ

PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM

دس سالہ بچی کی طرف دیکھا تھا جو ہنوز پُرشوق نگاہوں سے فاطمہ کی طرف دیکھتی سرخ گلابوں کی ٹوکری اٹھائے کھڑی تھی۔

اس نے سرخ فراک پہن رکھی تھی۔ بالوں میں سرخ ربن لگا رکھے تھے۔ ہاتھوں میں سرخ گلاب پکڑ رکھے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں آس چمک رہی تھی۔ جیسے فاطمہ خود چل کر اس کے پاس آئے گی۔ جیسے فاطمہ عون اور محمد کی طرح اسے خود سے لپٹا لے گی......اسے بہت پیار کرے گی۔

وہ آنکھوں میں ستاروں کی چمک لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی...... وہ چھوٹی سی بچی نہیں...... ''حورعین'' کھڑی تھی۔ اتنی ہی حسین، مہکتی، خوب صورت کہ نگاہ ٹھہرتی اور جم جاتی...... پھر ہٹتی ہی نہیں...... فاطمہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے قدم ہڈسن پارک کے اس تین منزلہ ریسٹورنٹ کے فرش نے پکڑ لیے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر جیسے جم گئی تھی۔ اس کی سانس تک رک گئی تھی۔ رگوں میں گردش کرتا لہو جیسے جم گیا تھا۔

پھر یوں لگا جیسے درو دیوار گھوم رہے ہیں۔ جیسے زمان و مکان بھول رہے ہیں۔ فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑتی۔ معاً وہ بچی چلتی ہوئی فاطمہ کے قریب آئی۔ اس کی چال میں شہزادیوں کی سی نزاکت تھی، اس کی آنکھوں میں معصومیت تھی، دل کشی تھی، وہ حورعین کی حمنہ تھی...... حورعین جیسی نازک، حسین، دلفریب، ویسی ہی نزاکتوں والی...... فاطمہ کو دوسرا جھٹکا تب لگا تھا جب بچی نے پھولوں کی ٹوکری اس کے پیروں میں رکھی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ فاطمہ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ایسا والہانہ انداز تھا کہ فاطمہ کا دل بیٹھ گیا۔

حورعین کی بیٹی کا یہ والہانہ انداز اس کے دماغ کی چولیں ہلا گیا تھا۔ اس کے سر پر ریسٹورنٹ کی چھت آن گری...... وہ ننھی بچی نہیں کسی ماہر رقاصہ کی طرح گول، گول گھوم کر گیت سنا رہی تھی۔

پھر وہ گیت کے اختتام پر کورنش بجالائی...... اور بعد میں اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔

''ویلکم ان ڈریم لینڈ ماما۔'' امر، عون اور محمد تالی بجا کر اس کی پزیرائی کرنے کی کوشش میں اسی کے انداز میں کورنش بجالائے تھے۔ پھر امر کی بیوی آمنہ نے اسے گلابوں کا بوکے دیا۔

اگر دیکھا جاتا تو ایسا استقبال بہنوں کا ہی ہوتا ہے اور فاطمہ کا تو دلہن بن کر بھی نہیں ہوا تھا۔ جب وہ فلوریڈا اسے دلہن بن کر ماموں کے گھر آئی تھی۔ اس وقت کو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

وہ حورعین کی بیٹی حمنہ کو دیکھ کر اس قدر شاکڈ تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو سہلا بھی نہیں سکی۔ ویسے بھی حمنہ کی طرف اس کا ہاتھ بڑھ ہی نہیں سکا تھا۔ اس کا ظرف اور دل تنگ پڑ گیا...... وہ حمنہ کی پزیرائی نہیں کر سکی۔ کیونکہ وہ حمنہ کی پزیرائی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی پھر فاطمہ نے پورا رستہ دیکھا ہی نہیں اس ننھی بچی کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ اور اس کی چمکتی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ سپر لگژری کیمری میں موجود کسی بھی فرد نے دھیان نہیں دیا تھا۔ حورعین کی بیٹی سب سے نظر بچا کر چپکے، چپکے آنسو بہا رہی تھی۔

☆☆☆

''اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں...... کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے اس کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔''

خالہ نے ایک مرتبہ فاطمہ کو بڑے جذب کے ساتھ سمجھایا تھا۔ اس وقت فاطمہ کو خالہ کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ دراصل وہ وقت انتہائی مایوس کن تھا...... فاطمہ کو کوئی روزن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی رستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ خود کو ایک بند گلی میں کھڑا پاتی تھی۔ جہاں پہ نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی دروازہ...... نہ روشنی تھی نہ ہوا...... وہ سب کچھ لٹا کر آئی تھی...... وہ اپنا قیمتی سرمایہ ہار کر آئی تھی۔ اس کا صدمہ، اس کا غم کوئی معمولی نہیں تھا۔ زندگی میں ہار جانا اتنا اذیت ناک نہیں ہوتا، جس قدر ٹھکرایا جانا درد ناک ہوتا ہے۔

انسان ہار جانے کی ذلت بھول جاتا ہے مگر ٹھکرائے جانے کی ذلت بُھلا نہیں پاتا۔

پھر فاطمہ کے تو دُہرے نقصان ہوئے تھے...... وہ دُہری اذیتوں میں مبتلا تھی...... اس کا گھر تو ٹوٹا ہی تھا، بچے بھی چھوٹ گئے...... اپنا وطن، جگہ اور جائے پیدائش تک چھوڑنا پڑی۔

وہ گھر سے بے گھر ہوگئی تھی۔ وطن سے بے وطن ہوگئی تھی۔ اس کے سارے رشتے دار اور تعلق ختم ہوگئے تھے یہاں تک کہ بچے بھی بچھڑ گئے تھے۔

تب خالہ تڑپ کر راتوں کو روتی ہوئی فاطمہ کو ایک چیز سمجھاتی تھیں۔

''یہ زندگی ہماری خواہشات کے مطابق نہیں ہوتی...... جہاں ہماری پسند کی چیز ہمیں میسر نہ آئے یا کھو جائے...... صبر وہاں کام آتا ہے۔'' خالہ جب تک زندہ رہیں اسے صبر کے سبق ہی پڑھاتی رہی تھیں۔ اور صبر تھا کہ آتا ہی نہیں تھا...... بہت سال وہ صبر کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔ صبر کی رمزیں سیکھتی، صبر کا قرینہ سیکھتی...... پھر بھی صبر سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر جب بہت سا وقت گزر گیا...... ماہ و سال کا شمار کرنا ترک کیا۔ رستے زخموں پر پھاہے رکھے تو صبر کی پہیلی خود بخود سمجھ میں آگئی۔ اس نے صبر کو بچھونا بھی بنایا اور اوڑھ بھی لیا...... سو زندگی کے دن ویران ہی سہی مگر گزرتے چلے گئے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا اور وقت اتنا آگے نکل گیا۔

زندگی کے اتنے سال چپکے سے نکل گئے...... وہ پوروں پر حساب رکھتی تو اس کی شادی کو قریب چودہ سال ہو چکے تھے اور علیحدگی کو دس سال......

وہ پورے دس سال بعد ایک مرتبہ پھر ماموں کے اسی کاٹیج میں گھوم رہی تھی۔ جس کے چپے، چپے پر پُراذیت یادیں بکھری تھیں۔ فاطمہ کے آنسو بکھرے تھے۔ اس کی آہیں بکھری تھیں۔

یہ ماموں کا وہی کاٹیج تھا جو اس کے لیے برزخ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آج اسی کاٹیج میں فاطمہ پورے استحقاق سے گھومتی تھی اور کوئی اسے ٹوکنے والا نہیں ہوتا تھا۔

ماموں تو پہلے بھی مداخلت نہیں کرتے تھے...... ہاں مامی اور ماہر تو تھے ناں...... جو اس کے لیے سراپا جلاد تھے۔ وہی ماہر اسے دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ بولنا ہی بھول گیا۔ شاید اس کے گمان میں تھا۔ فاطمہ مڑ کر آئے گی ہی نہیں......اور شاید فاطمہ کبھی نہ آتی۔ عمر بھر کے لیے اس پر لعنت بھیج دیتی۔

اگر وہ صرف ماہر کی بیوی ہوتی تو کبھی بھی اس گھر پر تھوکتی بھی نہیں۔ فاطمہ کو لوٹنا تو اس لیے پڑا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں سے مزید جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے رستوں میں عون اور محمد کھڑے تھے۔ وہ کس، کس موڑ پر انہیں نظر انداز کرتی؟ وہ کس، کس موڑ پر انہیں دیکھ کر منہ موڑ لیتی؟ یہ کام ایک سنگ دل باپ تو کر سکتا ہے مگر ایک مرمٹ جانے والی ماں نہیں کر سکتی۔

اور آج پورے دس سال بعد وہ پھر ماہر کی راج دھانی میں موجود تھی...... اور پورے اعتماد اور استحقاق کے ساتھ تھی کیونکہ پہلے اور اب کے وقت میں، سورج اور چاند جتنا فرق تھا...... دھوپ اور بادلوں جتنا فرق تھا۔ رات اور دن جتنا فرق تھا۔

حتیٰ کہ مامی بھی اس کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتی تھیں۔ وہ جو مرضی کرتی جیسی مرضی کوکنگ کرتی، ناپسندیدگی یا تنقید کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور ماہر بھی خاموش ہی رہتا۔

فاطمہ کو وہ وقت بھی یاد تھا جب ایک صبح اس نے ناشتے کی میز سجا کر مامی اور ماہر کو آواز دی تھی۔ وہ شادی کی پانچویں صبح تھی۔ کوکنگ میں اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بہت محنت و خلوص سے ناشتا بنا رہی تھی۔

گو کہ اسے یہ سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ ماہر کے دل کا رستہ نہ معدے سے ہو کر آتا ہے اور نہ ہی کسی اور سمت سے......وہ بس بڑی لگن سے ناشتا بنا رہی تھی۔ بالکل اپنی ماں کی طرح...... اس کی ماں بھی پاپا کے لیے اتنی ہی لگن سے ناشتا بناتی تھیں لیکن پاپا کا رویہ ممی سے بڑا ہتک آمیز ہوتا تھا۔ وہ کھانے کی پوری ٹرے کو جب دل چاہتا الٹ دیتے تھے۔ فلوریڈا میں اس کی ممی کے گھر

PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جیسا کوئی گھر نہیں ہوگا۔ اور اس کی ممی جیسی بھی کوئی ممی نہیں ہوں گی۔ فاطمہ کی ممی نے کبھی شوہر کی مار پیٹ اور بدتمیزی پر مشتعل ہو کر پولیس نہیں بلوائی تھی۔ کم از کم فاطمہ نے اپنے ہوش میں کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔

اس طرح پاپا کے جیسا کوئی بدتمیز شوہر فاطمہ نے پورے فلوریڈا میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھتی تھی پوری دنیا میں صرف پاپا جیسا ایک ہی مرد ہے...... انتہائی ال مینرڈ...... اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اس کے پاپا سے بڑھ کر بھی ایک مرد موجود ہے، جو اُن سے بدتہذیبی میں چار ہاتھ آگے تھا۔ پاپا غصے میں پوری ٹرے الٹ دیتے تھے اور ماہر غصے میں پوری میز الٹ دیا کرتا تھا۔ اس کا پہلا تجربہ فاطمہ کو شادی کے پانچویں روز ہوا تھا۔ جب ماہر کو ناشتا پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک، ایک چیز کو سونگھا اور میز الٹ دی۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ فاطمہ سہم کر چیخ پڑی تھی۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ پھر بھی ماہر کو رحم نہیں آیا تھا۔ وہ اگلے بیس منٹ تک چلّا رہا تھا۔ پھر اپنے میڈیکل اسکول چلا گیا۔ مامی آرام سے تماشا دیکھتی رہی تھیں۔ انہوں نے ماہر کو ٹوکا ہی نہیں تھا۔ الٹا ماہر کے جاتے ہی برس پڑیں۔

''کیا اتنا بدذائقہ کھانا پکاتی ہو؟ تبھی ماہر نے میز الٹ دی۔ تمہاری وجہ سے اتنا نقصان ہوا ہے۔ میز کا شیشہ بھی ٹوٹا اور برتن بھی...... تمہاری سزا ہے تم گھر کا سارا کام کرو گی، ڈرائیو وے سے برف بھی ہٹاؤ گی۔'' یہ مامی نے محض ٹریلر دکھایا تھا۔ پھر پوری فلم تو ہنی مون سے پہلے ہی چل پڑی تھی۔ مامی کے نخریلے ماہر کو کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ وہ پلیٹیں، گلاس، چمچے اٹھا، اٹھا کر نیچے پھینکتا تھا۔ غصے میں چلّاتا، گالیاں دیتا اور دہاڑتا رہتا تھا۔

پھر فاطمہ کو کچھ ہی عرصے بعد پتا چلا کہ ماہر کو اس کے ہاتھ کا کچھ بھی پسند نہیں تھا بلکہ سرے سے فاطمہ ہی پسند نہیں تھی۔ وہ اسے بھوتنی، کالی، بھدّی اور نہ جانے کیا، کیا کہتا تھا۔

سوچوں کا طویل سلسلہ اسے پھر سے بھٹکا رہا تھا۔ معاً وہ عون کی آواز پر حال کی دنیا میں لوٹی تھی۔

اس وقت سب فاطمہ کے ہاتھ کا بنا کھانا کھا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ کا ذائقہ پہلے جیسا ہی تھا۔ شاید ان سب کے ٹیسٹ بدل گئے تھے۔

اس کے بچے تو بہت رغبت سے کھانا کھا ہی رہے تھے مامی اور ماہر بھی خاموشی سے کھاتے رہے...... بغیر ناک چڑھائے...... ماتھے پر شکن لائے بغیر......

''شاید حورعین نے ماہر اور مامی کی عادتیں بدل دی تھیں۔'' اس نے تلخی کے ساتھ سوچا پھر خالی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

اسے دس سال بعد ایک مرتبہ پھر ماہر کی سلطنت میں آئے ہوئے آج آٹھواں دن تھا۔ وہ بہت جلدی اپنے بچوں کی پسند ناپسند کو جان گئی تھی۔ وہ کیا کھاتے تھے، کیا پہنتے تھے؟ فاطمہ کو چند دنوں میں ازبر ہو چکا تھا۔

وہ بڑی لگن، محنت اور چاہت سے کوکنگ کرتی رہی تھی۔ خالہ نے اسے پاکستانی کھانوں میں بھی طاق کر دیا تھا۔ گو کہ وہ اب بھی بہت لذیذ کھانا نہیں بناتی تھی پھر بھی اس کے بچے بے انتہا تعریف کرتے تھے۔

یہ بھی ایک ایسی ہی سہ پہر تھی۔

وہ کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی...... اس نے کریلوں کے ساتھ سبزی کا رائتہ بنایا تھا۔ اور سویٹ میں ایپل پائی...... عون اور محمد پاکستانی فوڈ کے زیادہ شوقین تھے۔

جب اس نے رات تک کا کھانا بنالیا...... تب میز بھی سجادی تھی۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا تھا، بچے ماہر کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ وہ اس کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ خاص طور پر حورعین کی حمنہ...... وہ تو پانی تک نہیں پیتی تھی۔ فاطمہ کو حیرانی ہوتی...... اپنی ماں والے سارے گُر اسے ازبر تھے۔ ساری اداؤں اور چالاکیوں سے واقف تھی۔ باپ کو کس، کس طرح خود تک محدود رکھنا ہے اپنی طرف متوجہ یا مصروف رکھنا ہے۔ وہ اتنی سی بالشت بھر کی لڑکی کو دیکھ، دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔

جب اس نے ڈنر سرو کیا...... تب کریلوں کو دیکھ کر ایک مرتبہ تو ماہر کے چہرے پر استعجاب اترا تھا اسی طرح حمنہ کے تاثرات میں بھی ناپسندیدگی نظر آئی۔ جبکہ عون اور محمد کے ساتھ مامی بھی بے نیازی سے کھانا کھا رہی تھیں۔ گویا انہیں بھی کھانے پر اعتراض نہیں تھا۔ پھر ماہر اور حمنہ کے تاثرات ایسے کیوں تھے؟ فاطمہ کو اندر ہی اندر کھد بدی ہوئی...... لیکن وہ ماہر کے سامنے اسے مخاطب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

بیٹی کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھ کر ماہر سے رہا نہیں گیا...... اور شاید اس کی آمد کے پچیسویں دن ماہر نے خود فاطمہ کو مخاطب کیا تھا وہ بھی اپنی نخریلی بیٹی کے لیے...... فاطمہ کے اعصاب کھنچ سے گئے تھے۔

''اس کو چیز آملیٹ بنادو......'' ماہر نے حمنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... وہ مخاطب فاطمہ سے تھا مگر دیکھ حمنہ کی طرف رہا تھا۔ حمنہ بھوکی رہے...... یہ اسے گوارا کہاں تھا...... کیونکہ وہ جانتا تھا حمنہ نان وجیٹیرین ہے۔ اسے سبزیاں پسند نہیں تھیں جبکہ ماہر دیکھتا تھا لنچ یا ڈنر میں سبزی ضرور ہوتی تھی...... اور اس کے ساتھ ہی کوئی اضافی آئٹم نہیں ہوتا تھا۔ حمنہ بنا ناپسندیدگی دکھائے چپ چاپ کھانا کھا لیتی تھی...... یہ اس کی بہت اچھی عادت تھی۔ وہ کوئی نخرہ یا اعتراض نہیں کرتی تھی لیکن حمنہ خود پر جبر کرے؟ یہ ماہر کی برداشت سے باہر تھا۔

اتنے دن ہو چکے تھے...... وہ خود سب دیکھ رہا تھا فاطمہ، عون اور محمد سے مینیو پوچھتی تھی۔ ان کی پسند کا کھانا بناتی تھی مگر حمنہ سے کچھ بھی پوچھنے کا تردد اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی حمنہ نے خفگی دکھائی تھی۔ نہ باپ سے شکایت کی...... وہ ایسی ہی فرمانبردار بچی تھی۔ وہ بہت امن پسند بچی تھی۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتی...... اسے پتا تھا وہ باپ سے شکایت کرے گی تو گھر میں لڑائی ہوگی۔

جب مامی، عون اور محمد اٹھ کر چلے گئے تب ایک مرتبہ ماہر نے فاطمہ سے کہا۔

''حمنہ کو کچھ بنادو...... وہ بھوکی رہے گی...... کھانا نہیں کھا رہی...... اسے سبزی پسند نہیں آئی۔'' ماہر کی آواز سن کر ایک مرتبہ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ حمنہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ فاطمہ کو پوری ایکٹنگ رہی تھی۔

وہ غائب دماغی سے ماہر کو دیکھتی رہی۔ جیسے اس کی بات سمجھنا چاہ رہی ہو...... ماہر اندر ہی اندر زچ سا ہونے لگا۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔

''حورعین نان وجیٹیرین ہے، مجھے پتا نہیں تھا...... نہ اس نے کبھی بتایا۔'' فاطمہ نے خاصی سنجیدگی دکھائی۔ ماہر پانی پیتے، پیتے چونک گیا۔

''حورعین؟'' اس کی آنکھوں میں استعجاب اتر آیا تھا۔ پھر اس نے حمنہ کی طرف دیکھ کر جتلایا۔

''حورعین نہیں، حمنہ...... اس کا نام حمنہ ہے۔''

''اچھا...... میرے ذہن سے نکل گیا......'' فاطمہ نے غائب دماغی سے سر جھٹک دیا تھا۔ ماہر کے ہونٹوں پر طنز پھسل پڑا۔

''تمہارے حواسوں پر حورعین ہی سوار ہے۔ اور ہمیشہ سے سوار ہے۔''

''اور آپ کے؟'' اس کا سوال بڑا کرارا قسم کا تھا کچن کی طرف بڑھتا ماہر لمحے بھر کے لیے رک گیا۔

''ظاہر ہے میرے بھی۔'' وہ کچھ اور جواب دینا چاہتا تھا مگر بات بدل گیا۔ اچھا تھا کلستی رہتی۔ اتنا نخرہ دکھا رہی تھی حد نہیں...... ایک آملیٹ بنانا تھا یا ہڈسن میں تیرنا تھا...... حد تھی اور واقعی حد تھی...... وہ غصے میں فرائنگ پین میں آئل ڈالنے لگا۔

اور فاطمہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

تو وہ آج تک اور ابھی تک حورعین کا ہی اسیر تھا۔ اسی کا عاشق، اسی کے عشق میں گرفتار...... فاطمہ کے اندر الاؤ بھڑکنے لگا تھا، شعلے پھیلنے لگے تھے اور حورعین آج بھی ان کے درمیان تن کے کھڑی تھی۔ کسی پہاڑ کے مانند جسے عبور کرنا کم از کم فاطمہ کے بس کا کمال نہیں تھا۔ اس کے پورے وجود پہ تھکن اتر آئی۔ افسردگی اتر آئی۔ رنجیدگی اتر آئی۔ دل چاہ رہا تھا۔ واپس کسی اندھے رستے کی طرف مڑے اور کھائی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

جا گرے یا کسی دریا میں کود جائے۔ جہاں نہ ماہر ہو اور نہ ماہر کی حورعین......

یہ دونوں فاطمہ کی زندگی کے ناسور تھے۔ عذاب تھے، زخم تھے، نا آسودگی کا برزخ تھے۔ وہ جانے کب تک برف کے مانند جمی رہتی۔ معاً حمنہ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”ماما! ڈیڈی کو چیز آملیٹ نہیں بنانا آتا...... وہ کنفیوزڈ ہیں۔“ حمنہ نے بھیگی نمناک آواز میں کہا تھا۔ جیسے باپ کی مشکل پر وہ سخت بے چین تھی۔ فاطمہ اچھی بھلی ششدر رہ گئی تھی۔ کیونکہ حمنہ کا انداز انتہائی شائستہ تھا، وہ اتنی سی بچی کی حسیات پر سخت متعجب تھی۔

فاطمہ نے چونک کر اوپن کچن میں دیکھا...... فرائنگ پین جل، جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور ماہر جانے کون سا مسئلہ حل کرنے کے لیے سوچوں میں مستغرق تھا۔

فاطمہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر حمنہ کو بری طرح سے جھڑک دیا۔

”اتنا باپ کا خیال ہے تو خود کرلو...... میری جان چھوڑو...... میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں......“ اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہوگئی تھی۔ یوں کہ ماہر تک ٹھٹک کر مڑا تھا اور حمنہ بھی ڈر کر سہم گئی تھی۔ اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا۔

ماہر کی چبھتی نگاہوں کی تپش پا کر وہ الٹے قدموں اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ جاتے، جاتے اس نے حمنہ کے چکنے گلابی گالوں پر آنسو بکھرتے دیکھے تھے۔ لمحے بھر کے لیے فاطمہ کو اپنے روڈ رویے پر افسوس ہوا پھر وہ سر جھٹک کر اندر چلی گئی کیونکہ ماہر کی نظروں میں کچھ ایسا تاثر ضرور تھا کہ جس نے فاطمہ کے دل کو اٹکا دیا۔ جیسے اسے امید نہیں تھی کہ فاطمہ، حمنہ کے ساتھ اتنا روڈ بی ہیویئر رکھے گی۔

پھر اس ساری رات فاطمہ کو نیند نہیں آئی۔ وہ پوری رات جاگتی رہی، سوچتی رہی...... جیسے ضمیر کی چبھن کا شکار ہو جیسے ساری رات حمنہ کے آنسو اسے بے چین کرتے رہے ہوں۔ پھر بھی وہ حورعین کی طرح خود کو کٹھور ہونے کا درس دے کر مضبوط کرتی رہی تھی۔ آخر حورعین نے گیارہ سال اس کے شوہر پر قبضہ جما کر اسے جلاوطن کیے رکھا تھا۔ اگر حورعین بے حس تھی تو فاطمہ بھی اس کی بیٹی کے لیے اتنی ہی بے حس ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

چودہ سال پہلے وہ فلوریڈا سے نیویارک آئی تھی۔ پھر چار سال سے بھی کم مدت کے بعد ذلت اور رسوائیوں کے داغ لے کر پاکستان چلی گئی۔

اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟ وہ فلوریڈا واپس کیوں نہیں گئی؟ فاطمہ آج بھی اسی سوال کے گرد گھومتی تھی۔

ماہر کی بے وفائی کا صدمہ لے کر اسے فلوریڈا جانے سے امر نے روکا تھا۔ وہی تو تھا جس نے بھاگ دوڑ کر کے فاطمہ کا پاسپورٹ بنوایا تھا۔ پاکستان کا ویزا لگوایا تھا۔

یہ امر کی خواہش تھی کہ فاطمہ پاکستان چلی جائے...... وہاں جا کر حورعین کی ماں یعنی اپنی خالہ کو اس کے کرتوت بتائے...... کیا خبر اس کی ویران اور اجڑی زندگی کی کہانی سن کر خالہ کو جلال آجائے...... وہ امریکا پہنچ کر ماہر اور حورعین کی طلاق کروادیں۔

تب فاطمہ کو بھی یہی مناسب لگا تھا...... پھر فلوریڈا میں اس کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ اپنے بے حس باپ کے پاس وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی تعلیم اس کے پاس نہیں تھی۔ ہنر کوئی آتا نہیں تھا۔ نہ کوئی جاب تھی، نہ فنانشلی اسٹرانگ پوزیشن تھی...... اسے پتا تھا کہ پاکستان میں اس کی خالہ بہت امیر ہیں...... کم از کم فاطمہ کو رہنے کے لیے چھت اور عزت کی روٹی تو ضرور ملے گی۔ اس سے زیادہ کی اسے چاہ نہیں تھی۔

وہ پاکستان تو چلی آئی...... خالہ کو اپنی دردناک کہانی بھی سنائی۔ خالہ نے اس غم کو سر پر سوار بھی بہت کیا...... اسپتال جا پڑیں۔ حورعین سے قطع تعلقی کرلی...... اور قسم کھائی کہ زندگی بھر اس سے کلام

نہیں کریں گی...... حالانکہ فاطمہ نے بہت زور دیا تھا۔ بہت کوشش کی...... خالہ امریکا جائیں...... بیٹی سے پوچھیں...... اسے غیرت دلوائیں...... ماہر کو مجبور کریں، وہ اسے طلاق دے...... مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ خالہ نے حورعین سے بات ضرور کی تھی مگر اس کے بعد وہ چپ سی ہوگئی تھیں۔

انہوں نے پھر حورعین کو برا بھلا نہیں کہا تھا۔ بلکہ ایک چپ کی بکل میں گم ہوگئیں۔ فاطمہ نے لاکھ سر پیٹا مگر جواب ندارد تھا۔ وہ اسے صبر کرنے کا بس مشورہ دیا کرتی تھیں۔

حالانکہ امر بھائی کے کہنے پر فاطمہ نے رو، رو کر سارا واقعہ بار، بار خالہ کو سنایا تھا۔

”صرف اپنے عشق کی آگ بجھانے کی خاطر ماہر نے مجھے بدکردار کہا...... عیاش کہا...... کال گرل کہا...... اور بچے چھین کر مجھے گھر سے نکال دیا...... مجھے ہر رشتے سے بے دخل کردیا...... صرف اس حورعین کی وجہ سے...... آپ کی بیٹی نے میرا گھر اجاڑ دیا......“ وہ ساری، ساری رات روتی اور تڑپتی تھی...... اسے غم کے لمبے، لمبے دورے پڑتے...... بہت سال وہ دنیا سے کٹی رہی...... یہ خالہ کی کوششیں اور بدعائیں تھیں جو رنگ لائی تھیں اور فاطمہ بہت سال کے بعد کچھ سنبھل گئی تھی۔

اس وقت وہ کالج کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ یہاں سے امریکی ہائی وے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ دنیا کا بہترین ٹریفک نظام امریکا میں دکھائی دیتا۔ جگہ، جگہ سائن بورڈوں پر شہروں، قصبوں اور ریاستوں کے میں بارے میں لکھا ہے۔ کوئی بھی اجنبی محض نقشے کی مدد سے پورے امریکا کی سیر کرسکتا ہے۔ کسی سے رستہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔

لیکن فاطمہ ایک ایسی امریکی لڑکی تھی جو نقشے کو پکڑ کر بھی اجنبیوں سے اپنے ہی گھر کا رستہ پوچھتی پھرتی...... چاہے کوئی ٹھیک بتاتا یا غلط...... فاطمہ کو اندھا دھند دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت تھی...... ایک بات تو سچ تھی...... اس نے کبھی اپنی عقل کا استعمال نہیں کیا تھا۔ اسی لیے ماہر اپنی ماں پر چلاتا رہتا تھا۔

”کس احمق اور بدھو کو میرے ساتھ باندھ دیا...... اس میں عقل نام کی نہیں...... اتنی احمق اور گاؤدی ہے...... کسی بات کا پتا نہیں چلتا...... فلوریڈین گائے ہے۔“ ماہر کی بازگشت آج بھی فاطمہ کو سالوں پیچھے لے جاتی تھی۔ تب بھی وہ احساسِ توہین پر رو پڑتی...... چیخ اٹھتی اور پاگل ہو جاتی تھی۔

اور جب وہ صدمے کی انتہا پر بھاں، بھاں کر کے روتی تب بھی ماہر کا پارہ آسمان پر چڑھ جاتا......

”اس کو رونے کا بھی سلیقہ نہیں...... کوئی ایسے

رونے کا فائدہ

امریکا کے ایک ممتاز ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ولیم فیری نے اپنی طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا ہے کہ آنسوؤں کا انسان کی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ جذباتی دباؤ کے وقت انسانی جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور جسم کے اندر مختلف غدودوں سے خاص مواد نکل کر خون میں شامل ہو جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ رونے کے بعد انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر فیری کا خیال ہے کہ جذباتی دباؤ کے نتیجے میں جسم میں کیمیاوی عمل ہوتا ہے۔ وہ آنسوؤں کے ذریعے زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ روتے نہیں ہیں وہ مختلف قسم کے امراض میں بالخصوص السر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے تحقیق کی ہے کہ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ السر کے مریض ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جذباتی آنسو، پیاز کے ذریعے بہنے والے آنسوؤں سے کیمیاوی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے سو افراد کو پیسے دے کر ان کے آنسو حاصل کیے اور ان پر مختلف تجربے کیے ہیں۔

مرسلہ: ماریہ عقیل، لاہور

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

روتا ہے؟ آخر حورعین بھی تو ہے ناں...... وہ تو ایسی نہیں...... وہ تو بالکل ایسی نہیں...... آپ کو یہ الو کی دم ملی تھی میرے لیے...... کیا حورعین دکھائی نہیں دی......؟" ماہر جب بولنے پر آتا تو ذرا بھی لحاظ نہیں رکھتا تھا۔ ایسے، ایسے فضول الفاظ کا استعمال کرتا تھا کہ بندہ مٹی تلے گھس جانے کی خواہش کرنے لگتا۔

پھر ماہر کو اس کی عمر پر بھی اعتراض تھا۔ اسے میچورڈ لڑکیاں پسند تھیں۔ حورعین جیسی...... فاطمہ کم عمر تھی...... اسے ڈریسنگ کرنے کا، کوکنگ کا، گھر سنوارنے اور شوہر کا دل جیت لینے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ جانے وہ کون عورتیں ہوتی ہیں جنہوں نے اتنے، اتنے دیو ہیکل شوہروں کو بھی دام میں کر رکھا ہوتا ہے۔ ایک فاطمہ تھی اسے شوہر کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کا بھی طریقہ نہیں آتا تھا۔

اوپر سے مامی اس کی انسلٹ پہ بہت خوش ہوتی تھیں۔ اصل میں حورعین انہیں بھی پسند تھی اور فاطمہ کی پوری فیملی کو وہ سخت ناپسند کرتی تھیں۔ شاید اس کے پاپا کی وجہ سے ورنہ اس کی ممی تو آئیڈیل ماں بلکہ آئیڈیل عورت تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند، شرمیلی، نیک اور دبو...... انہوں نے فاطمہ کی تربیت بھی ایسی ہی کی تھی، یہ خبر نہیں تھی کہ ان کے بھتیجے کو ایسی لڑکیوں سے انتہائی چڑ اور نفرت تھی۔

وہ بااعتماد اور باوقار لڑکیوں کو پسند کرتا تھا۔ جو سوبر ہوں، دھیما بولیں، کسی بھی پرابلم کو سولو کرنے کے پہلو سوچیں ناں کہ چیخ، چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیں۔ اسے جذباتی اور اعصابی طور پر مضبوط، پاورفل اور اسٹرانگ خواتین اچھی لگتی تھیں جبکہ فاطمہ میں ایسی کوئی بھی خوبی نہیں تھی۔

وہ خود سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اگر کوئی اسے مشورہ دیتا، اچھا یا برا تو وہ اس پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرلیتی...... دل و جان سے عمل کرنے کی کوشش کرتی...... خود سے اس کے اچھے، برے پہلو پر غور نہیں کرتی تھی۔

اس کی ممی نے بہت حد تک اسے محتاج بنا ڈالا تھا۔ وہ کبھی اکیلی گھر سے اسکول تک نہیں گئی تھی۔ ممی نے اسے سہیلیاں بھی بنانے نہیں دیں۔ اسے اسٹور تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے تئیں ممی اسے ارد گرد کے بے باک ماحول کی پرچھائیوں سے دور رکھتی تھیں۔ یہ خبر نہیں تھی کہ بیٹی میں اعتماد ختم ہوتا جارہا ہے۔ وہ ماہر جیسے بندے کے ساتھ کس طرح سے رہے گی؟ کیسے گزارہ کرے گی؟ نیویارک کی کھلی سڑکوں کو دیکھتی وہ فلوریڈا میں ممی کے پہلو سے جاچکی......

"اُف یادیں اور رُلا دینے والی یادیں......" ممی کی یاد نے اسے نمناک کردیا تھا۔ جیسے ہی اس نے گردن گھمائی پیچھے ماہر کو کھڑا دیکھ کر حواس باختہ ہونے کے بجائے اکڑ گئی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ ماہر اس کی تلخ کلامی پر باز پرس کرنے آیا ہے۔ مگر وہ ہوتا ہے کون تھا باز پرس کرنے والا؟ دس سال پہلے اس کی ناک تلے عشق کا کھیل رچا کر، اپنی محبوبہ سے ایک بچی پیدا کر کے آج بھی اتنا تن کے کھڑا تھا۔ جیسے اسے اپنے کسی بھی عمل پر پشیمانی نہیں تھی۔

جیسے اسے اپنی پہلی بیوی کو گھر سے دھتکارنے اور بچے چھین لینے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اگر وہ اپنے بچوں کی خاطر اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آ ہی گئی تھی تو کم از کم ماہر کا فرض تو بنتا تھا۔ فقط ایک لفظ معذرت اور شرمندگی کا اس کی سماعتوں میں اتار دیتا لیکن فاطمہ کو لگتا وہ اس کے لوٹ آنے پر کچھ اور اکڑو خان بن گیا تھا...... اندر ہی اندر جانے کتنا مسرور ہے...... ایک بیوی کو دھتکار کر، دوسری شادی بھی رچالی...... بیٹی بھی ہوگئی...... اور محبوبہ کے مرجانے کے بعد پہلی بیوی نے گھر بھی آ کے سنبھال لیا...... کتنے مزے تھے ان مردوں کے جو یورپی ہوتے ہیں یا پاکستانی...... ویسے بھی پاکستانی مغرب کے ماحول میں پیدا ہو کر بھی ذہنی طور پر رہتے پاکستانی ہی ہیں، وہی بیویوں کو نیچا دکھانے والی پرانی اور گھٹیا برصغیرانہ غلام قسم کی سوچ......

اس وقت فاطمہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے ماہر کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر کافی دیر بعد ماہر کو خود ہی بولنا پڑا...... شاید وہ فاطمہ کی پہل کا انتظار کر رہا تھا۔

"حمنہ کے ساتھ اتنا روڈلی بی ہیو کرنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بہت کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ فاطمہ کے اعصاب بھی تن گئے تھے۔ حمنہ کے لیے اس کی چاہت پہ وہ شدید جلن محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ ایک بچی سے کیا حسد کرنا؟ لیکن وہ اپنی کیفیات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"میں ایسی ہی ہوں۔" اس نے اپنے تئیں بڑا تنک کر کہا تھا...... ماہر کو شاید ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے چپ کر گیا تھا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تم میں کچھ تبدیلی آچکی ہے لیکن تم تو وہی ہو...... میں نے ہی تمہیں دوبارہ بلوا کر غلطی کی......" اس کے انداز میں تاسف بھر گیا تھا۔ اور فاطمہ کے تو سر پہ جا لگی تھی...... اس کی آنکھیں احساسِ توہین سے لال ہوگئیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" فاطمہ نے غصے سے کہا۔

"بہت خوب، مطلب بھی میں ہی سمجھاؤں تمہیں...... اپنا کیا دھرا بھول چکی ہو...... جو کچھ تم نے کیا...... وہ ایسا شرمناک تھا کہ تمہیں تو میرے سامنے اتنا اکڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بھی سو مرتبہ سوچنا چاہیے تھا۔ مگر تم اپنے انگریز بے مذہب اور بے دین باپ کی طرح ڈھیٹ اور بے غیرت ہو۔" ماہر کے الفاظ نے فاطمہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا۔ آنکھیں آگ برسانے لگیں۔

"جسٹ شٹ اپ......" وہ چلّا اٹھی تھی۔

"چلّاؤ مت فاطمہ...... میں خود بھی ماضی کو دُہرانا نہیں چاہتا...... اور ایسا قابلِ فخر ماضی ہے بھی نہیں...... جسے اچھے دنوں کی طرح یاد کیا جائے...... اگر میں سب کچھ بُھلا چکا ہوں تو تم بھی پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ بہتری اسی میں ہے...... اور باقی یہ ہے کہ حمنہ کے ساتھ برتاؤ میں تبدیلی لاؤ...... وہ اتنی سمجھدار نہیں جو تمہاری تلخی کو برداشت کرسکے۔" ماہر کا لہجہ اب بھی روکھا اور کھردرا تھا۔

"میں نے حمنہ کو کیا کہہ دیا؟" وہ اب کی دفعہ کچھ پست آواز میں بولی۔

"جو کہا ہے اب ایسا مت کہنا...... میری بیٹی بہت ہی حساس ہے۔" ماہر نے جیسے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔ پھر نپے تلے قدم اٹھاتا پلٹ گیا۔ جبکہ فاطمہ ہونٹ کاٹتی غصے میں بڑبڑاتی رہ گئی۔

☆☆☆

ماہر سے اس دن کی تلخ کلامی کے بعد دوبارہ بات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ حمنہ کے حوالے سے ماہر کی شکایات دور ہوچکی تھیں۔ فاطمہ خاص طور پر ماہر کی موجودگی میں جتا، جتا کر حمنہ سے پوچھتی تھی۔

"آج لنچ میں کیا ہو؟ یا ڈنر میں کیا بناؤں؟" وہ واضح طور پر ماہر کو سنا کر حمنہ کو مخاطب کرتی تھی جواباً حمنہ اپنا فرمائشی پروگرام بے تکلفی سے نشر کردیتی۔ فاطمہ نے ایک بات شدت سے نوٹ کی تھی۔ حمنہ بہت زیادہ فاطمہ کے قریب ہونا چاہتی تھی۔ وہ بہانے، بہانے سے فاطمہ کو متوجہ کرتی...... اس سے پیار لینے کی کوشش کرتی اور پھر بہت لاڈ سے گلے میں بانہیں ڈال کر جتاتی۔

"ماما......! آپ میری پرنسس ہیں۔" اکثر لاڈ کے یہ مظاہرے ماہر کے سامنے ہونے لگے تھے۔ اور وہ ٹی وی دیکھتا اچانک چونک جاتا تھا۔

"ایسا قاتلانہ جھوٹ......" اس کی بڑبڑاہٹ بہ آسانی فاطمہ کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی تھی گو کہ وہ جواب نہیں دیتی تھی اور نہ ہی ظاہر کرتی تھی کہ اس نے ماہر کی بڑبڑاہٹ سن لی ہے تاہم وہ جانتا ضرور تھا کہ اندر ہی اندر وہ سلگتی ہے۔ حمنہ اکثر اپنے ایکسٹرا لاڈوں کی وجہ سے اسے شرمندہ کرواتی تھی۔

ایک دن بڑے جوش میں کہنے لگی۔

"میری ماما سے اچھی کوکنگ کوئی نہیں کرتا...... آپ میرے لیے نوڈلز بنائیے گا۔ چکن نوڈلز......" حمنہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے رویے میں روکھا پن پا کر بھی بڑے دعوے سے فرمائشیں کرتی تھیں۔ تب ماہر بھی اخبار دیکھتا متوجہ ہوا۔ پھر چھت کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتا ہوا اٹھا تھا۔

''اللہ میرے بچوں کے معدوں پر رحم کرے۔''

کچن کی طرف جاتی فاطمہ لمحے بھر کے لیے رک گئی تھی پھر اس نے تیکھے ابرو اٹھا کر کہا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی...... میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھا کر لوگ اب میزیں کیوں نہیں الٹتے...... ایک بات پہ سارا کریڈٹ حمنہ کی ماں کو ضرور جاتا ہے...... اس نے ناک میں نکیل ڈال کر پالنے کے بگڑوں کو سدھار دیا...... یہ کمال حورعین کے ہی پاس تھا۔'' اس کا انداز بھرپور سراہتا ہوا تھا...... ماہر باہر جاتا، جاتا رک گیا۔

''چلو، تم نے کسی بات پر حورعین کو کریڈٹ تو دیا۔''

''حورعین تو آسکر کی حقدار تھی...... دوسروں کے گھروں پہ شب خون مارنا عام بندے کا کام نہیں ہوتا۔'' اس کے طنز کی کاٹ کو جانے کیسے وہ ضبط سے پی گیا تھا۔ شاید حمنہ کا احساس کر کے...... ورنہ فاطمہ تو جانتی تھی منہ توڑ جواب دیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔

''ذرا اپنے الفاظ میں ترمیم کر لو...... شب خون حورعین نے نہیں مارا بلکہ تم نے ہماری زندگیوں میں کسی ناگہانی بلا کی طرح انٹری دی تھی، مجھے کچھ دہرانے کی ضرورت نہیں...... تم ایک، ایک حقیقت سے آشنا ہو۔'' اس نے جس بات کی طرف اشارہ دیا تھا وہ فاطمہ اچھی طرح جانتی تھی...... یہ ایک ویک پوائنٹ تھا...... سو وہ چپ کر گئی۔

''میں نے کسی کے ساتھ لو میرج نہیں کی تھی...... نہ میں کورٹ میرج کے ذریعے آئی...... مجھے مامی اور ماموں شادی کر کے لائے تھے۔'' فاطمہ نے بڑے...... دوٹوک انداز میں جتایا تھا۔

''اور ابھی تک میں اسی گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اللہ کرے کسی کا بھی کسی بے عقل عورت سے واسطہ کبھی نہ پڑے۔'' ماہر کا انداز ہلکا پھلکا ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات بڑھ کر اور رخ اختیار کر لے۔

تعلقات ویسے بھی خاصے کشیدہ تھے۔ مزید کشیدگی کی گنجائش نہیں تھی۔

''آہ...... عقل مند عورت تو ملی تھی...... بس نصیب ہی خراب تھے۔ حورعین ہوتی تو میں یہاں نہ ہوتی۔'' اس نے بڑی تلخ اور کاٹ دار بات کی تھی۔ ماہر لمحے بھر کے لیے چپ ہوا جیسے کچھ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''حورعین ہوتی بھی تو تم یہیں ہوتیں، حورعین کا مرجانا کوئی بہانہ نہیں بنا تھا۔ اس کی زندگی میں ہی اگر مجھے کچھ حقیقتوں کا پتا چل جاتا تو تب بھی تم یہیں ہوتیں۔'' اس نے بڑے مستحکم لہجے میں جواب دیا تھا۔ اب چپ ہونے کی باری فاطمہ کی تھی۔

''تو گویا دس سال کا کشٹ کاٹنے کے بعد آپ کو احساس ہوا کہ تب کچھ غلط ضرور ہوا تھا؟'' وہ جیسے شدتِ غم و غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

''غلط ہوا نہیں تھا فاطمہ......! تم نے غلط کیا تھا؟ مان جاؤ کہ تم انتہائی احمق ہو...... جو بھی ہوا تمہاری بے خبری میں ہوا...... جس کا بھگتان ہم سب نے بھگتا...... سزا تم نے بھی کاٹی اور میں نے بھی......'' ماہر لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

''سزا کس نے کاٹی؟ ماہر ارباب نے...... ہرگز نہیں تم نے تو حورعین کے ساتھ اچھا وقت گزارا...... امتحان تو سارے میرے لیے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کی جدائی سہی...... ملک بدر ہوئی...... ایک گھٹن زدہ زندگی تک محدود رہ گئی تھی اگر خالہ نہ ہوتیں تو میں مرجاتی۔'' فاطمہ کے جانے کون، کون سے ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔

''اور مجھے میرے باپ کا آخری منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔''

''اس کا تو نام ہی مت لو......'' ماہر کا انداز ہر خند تھا...... مامی اور ان کا لختِ جگر فاطمہ کے پاپا کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ شاید وہ انگریز تھے یا پھر کوئی اور وجہ......؟

''تو پھر کس کا نام لوں......؟ اس آزمائش کا جو میرے ہی نصیب میں تھی...... اس امتحان کا جو دس سال پر محیط ہو گیا تھا...... کون میرے دس سالوں کے عذابوں کا حساب دے گا؟ کون میرے ماہ و سال کا حساب دے گا؟ میرے بچوں نے جو میرے بغیر وقت گزارا...... میں نے اپنے بچوں کی جدائی کس طرح برداشت کی کوئی میری تکلیف کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔'' فاطمہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ شاید ماہر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا...... وہ خاموش ہو گیا تھا۔

''لوگ خوش نصیب ہیں جو چاہتے ہیں پا لیتے ہیں۔'' اس کا اشارہ حورعین کی طرف تھا۔ وہ بڑے درد بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے اسے مری ہوئی حورعین پہ بھی رشک آ رہا تھا۔

ماہر اسے دیکھتا رہا...... وہ آج بھی ایسی تھی جلد باز، جذباتی، بات بے بات آنسو بہانے والی... جلدی بدگمان ہونے والی...... ہر تاثر کو ظاہر کر دینے والی۔

''تم حورعین کی بات کر رہی ہو؟'' ماہر نے عجیب انداز میں پوچھا تھا۔

''ظاہر ہے...... حورعین کے بجائے کوئی اور اتنا قابلِ رشک ہو سکتا تھا؟'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

''اچھا...... بھلا وہ کیسے خوش نصیب تھی؟'' ماہر نے اگلا سوال داغا...... فاطمہ بغیر رکے شروع ہو چکی تھی۔

''اس کے پاس اتنی قابلیت تھی، وہ اتنی کامیاب تھی پھر اسے من چاہی محبت ملی......'' اس کا لہجہ حسرت آمیز ہو چکا تھا۔ ماہر اسے تاسف سے دیکھتا رہا۔

''مجھے آج پتا چلا ہے حورعین کو تمہارے حسد کی نظر لگ گئی تھی۔'' اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا...... جس پر وہ چلا اٹھی تھی۔

''میں کیوں اسے نظر لگاتی؟ وہ میری خالہ زاد بہن تھی۔''

''لیکن تم نے ہمیشہ اس سے نفرت کی۔'' ماہر کو جتلانا پڑا تھا۔ فاطمہ چپکی سی رہ گئی۔

''اس نے میرا گھر اجاڑا تھا۔''

''اس نے تمہارا گھر نہیں اجاڑا تھا...... یہ کام تم نے خود کیا......؟'' ماہر اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا...... فاطمہ ہکا بکا رہ گئی۔

''میں نے خود؟'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی...... ''مگر کیسے......؟'' اس کا دل کسی انہونی کے خوف سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ماہر لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گیا جیسے کسی سوچ میں گم ہو... اس کے چہرے پر تفکر کا جال تھا اور ان سارے ماہ و سال کی کہانی درج تھی جس کا وقت اور ایک، ایک لمحہ بھاری تھا۔ اتنا ہی بھاری جس قدر فاطمہ پر بھاری تھا۔

وہ جانے کیا، کیا سوچتا رہا کس، کس انداز میں سوچتا رہا۔

پھر جب بولا تو اس کی آواز پہلے کی طرح روکھی اور کھردری تھی۔

''اپنے باپ پر بھروسا کر کے......'' ماہر کے جواب نے فاطمہ کو سرتاپا فریز کر دیا تھا۔

☆☆☆

''ضد اور ہٹ دھرمی صحیح رائے کو بھی دور کر دیتی ہے۔''

یہ بات بہت پہلے فاطمہ کی ممی نے اس کے لیے کہی تھی اور وہ حیران ہوتی تھی کہ اس میں ضد اور ہٹ دھرمی کہاں ہے؟ اپنے تئیں وہ بڑی فرمانبردار تھی، ممی کی ہر بات مانتی تھی۔ ان کی ہر بات کو سمجھتی تھی...... لیکن ممی نے کہا تھا۔

'' فاطمہ خاموش ضدی اور خاموش ہٹ دھرم ہے۔'' اس بات کا بھلا کیا مفہوم تھا؟ فاطمہ کبھی نہ سمجھ پائی لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس میں کچھ عادتیں اپنے باپ والی ضرور موجود تھیں...... اس کا باپ بھی ہٹ دھرم تھا...... اپنی بات پر ڈٹا رہتا اور منواتا چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی فاطمہ بھی ضدی اور ہٹ دھرم تھی۔ گو کہ وہ اپنے باپ کی طرح شور نہیں مچاتی تھی مگر اندر ہی اندر وہ اپنی سوچی ہوئی رائے پر قائم رہتی...... چاہے وہ رائے

PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

غلط ہوتی یا ٹھیک ہوتی...... وہ اپنے ذہن میں آئی سوچ پر عمل کر گزرتی تھی...... لیکن اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی اس کی پشت پناہی ضرور کرتا تھا۔ ماموں کے گھر دس سال بعد آ کر بھی وہ ان نکتوں کو آج تک سوچ نہیں پائی تھی جو ماہر اور اس کے درمیان علیحدگی کا باعث بنے تھے۔

اس کی اپنی سوچ اور خیال حورعین تک ہی محدود تھے...... وہ حورعین جو اس کی زندگی میں بھونچال لائی تھی۔ وہ حورعین جو اس کی زندگی میں تہلکہ مچا گئی تھی۔

لیکن اس کے پیچھے کوئی ایک وجہ بھی ضرور تھی......

یہی ناں کہ ماہر ارباب کو حورعین سے محبت تھی...... اس سے بڑی وجہ علیحدگی کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔

چھٹی کے روز مامی نے ایسے ہی حورعین کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''بعض لوگ بڑے ہی بدقسمت ہوتے ہیں۔ نہ قابلیت ان کے کام آتی ہے نہ حسن اور نہ ہی محبت......'' مامی کے لہجے میں آج بھی حورعین کے لیے ہمدردی محسوس کی جاسکتی تھی...... آہ، حورعین جا کر بھی ان لوگوں کی زندگیوں میں موجود تھی۔ پھر بھی یہ لوگ سمجھتے تھے حورعین بدقسمت ہے۔

''آپ کے بیٹے نے اس سے عشق فرمایا تھا۔ پھر بھی وہ بدقسمت تھی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی فاطمہ کے لہجے میں جلن در آئی تھی۔

''حورعین کو تو نظر ہی کھا گئی۔ عشق، محبت کسی کے کام کیا آتے ہیں؟ جب قسمت ہی ساتھ نہ دے۔'' مامی کا لہجہ ہنوز وہی تھا۔

''اسے ماہر مل گیا تھا تب بھی وہ بدنصیب تھی؟'' اس نے کڑھتے ہوئے کہا۔

''ماہر تو تمہیں بھی مل گیا تھا...... ماہر کا مل جانا کیا خوش قسمتی کی علامت ہوتا ہے؟'' مامی کے اگلے الفاظ اسے ہکا بکا کر گئے...... کچھ پل کے لیے فاطمہ کچھ بول نہیں پائی...... ایک دم گم صم ہو گئی تھی۔

''ماہر کو مجھ سے محبت تو نہیں تھی ناں......'' اسے بات کرنے کے لیے ایک پوائنٹ مل ہی گیا تھا۔

''اچھا......'' مامی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا...... ''اگر محبت نہیں تھی تو دس سال بعد تم یہاں نہ ہوتیں۔'' ان کا انداز بھرپور جتلانے والا تھا۔

''میرا یہاں دوبارہ آنا ماہر کی مجبوری نہیں...... اسے بچوں کی خاطر مجھے بلوانا پڑا......'' وہ سبزی کاٹتی بہت آزردہ ہو گئی تھی۔ جانے کیا، کیا باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ عموماً وہ گزری باتیں بھلاتی ہی نہیں تھی۔

''تم جو بھی سمجھ لو......'' مامی نے گہری سانس کھینچی۔

''محبت اسے بس حورعین سے تھی۔'' اس نے جلے دل کا پھپھولا پھوڑ ہی دیا۔

''اس کا جواب ماہر سے لینا۔'' انہوں نے صاف دامن بچا لیا۔

''ماہر بھلا کیا جواب دے گا۔ اس کی نشانی کو سینے سے لگا تو رکھا ہے......'' فاطمہ نے کلس کر کہا۔ اشارہ حمنہ کی طرف تھا کیونکہ حمنہ میں ماہر کی جان بند تھی۔ وہ حمنہ کے معاملے میں ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''کمال ہے۔'' مامی کو پھر سے طنز سوجھا تھا۔ ''تمہاری بھی دو نشانیوں کو اس نے سینے سے ہی لگا رکھا تھا۔'' ان کا اشارہ اس کے بیٹوں عون اور محمد کی طرف تھا۔

''لیکن میرے ساتھ زیادتی تو کی تھی ناں......'' اسے اپنے خسارے رہ، رہ کر یاد آنے لگے۔ ''مجھے گھر سے نکالا تھا......''

''یہ تمہاری اپنی غلطیوں کا خمیازہ تھا...... ٹھیک ہے تب ماہر غصے میں تھا...... لیکن اس نے تمہیں بعد میں بلوایا بھی تھا۔'' مامی نے جتلاتے ہوئے کہا تھا...... فاطمہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''کب بلوایا تھا...کب؟'' اسے تو پچھلے دس سالوں میں ایک بھی ماہر کی فون کال موصول نہیں ہوئی تھی۔

اور مامی کیسا سفاک جھوٹ بول رہی تھیں۔

''کیا تمہارے ماموں نے ایک ہزار ایک فون نہیں کیے تھے؟ کیا وہ تمہیں لینے پاکستان نہیں گئے......؟ کیا میں نے فون نہیں کیے......؟ کیا حورعین نے تمہاری منتیں نہیں کی تھیں؟ گو کہ شروع کے چند سالوں میں ماہر کا غصہ نہیں اتر رہا تھا۔ وہ تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن بعد میں ماہر نے تم سے رابطہ کرنے کے لیے ہمیں مجبور کیا...... شاید اس کا غصہ اتر گیا تھا یا پھر بچوں کی وجہ سے...... اور اب بھی تمہیں ماہر ہی نے بلوایا ہے......'' مامی ایک ہی سانس میں اس کی آنکھیں کھولتی چلی گئی تھیں۔

''اور تم تب بھی نہیں آئیں...... تم خود نہیں آئیں...... کیونکہ تم ہٹ دھرم ہو......''

''ماہر لینے آتا تو آ جاتی...... میں خود سے کیوں آتی؟ ماہر نے حورعین کی وجہ سے مجھے گھر سے نکالا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نکلتی تو اس کی خواہش پوری ہوتی......'' فاطمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ مامی اسے تاسف سے دیکھتی رہ گئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''تم اپنی غلطی بلکہ گناہ کبھی تسلیم نہیں کرو گی۔'' مامی زیرِ لب بڑبڑا کر رہ گئیں...... ان کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ فاطمہ بہ آسانی سن سکتی۔ اسے بے انتہا دکھ ہوا تھا۔ آخر اب بھی مامی کی نظر میں فاطمہ ہی بری تھی۔

''میں نے کیا گناہ کیا تھا......؟ بتائیں مجھے...... جو بھی ہوا، میرا اس میں کیا قصور تھا؟'' وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''پتا نہیں...... لیکن ہم سب نے بہت ٹف ٹائم گزارا تھا تب...... ماہر تو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ تمہیں طلاق دینا چاہتا تھا۔ یہ تو ہم سب نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا تھا۔'' مامی شاید اب کریڈٹ لینے کے چکروں میں تھیں...... فاطمہ نے کم از کم یہی سمجھا تھا۔

''پھر تم اپنی غلطی ماننے کے بجائے اکڑ بھی گئیں۔ فلوریڈا جانے کے بجائے پاکستان چلی گئیں۔ امر کو تم نے فورس کیا...... تمہیں پاکستان بھجوائے...... پھر حورعین کی ماں کو ہمارے خلاف کر دیا۔'' مامی بھی تاک، تاک کے حملے کر رہی تھیں۔ اگرچہ ساری باتیں ہی ٹھیک تھیں پھر بھی اسے بہت دکھ ہو رہا تھا۔

''مجھے بھی امر نے ہی کہا تھا...... تم پاکستان ریلیکس ہونے چلی جاؤ......'' فاطمہ کی آواز دبی ہوئی تھی۔

''اس نے تمہیں ریلیکس ہونے کو کہا تھا کیونکہ ان دنوں تم بھی ڈپریسڈ تھیں، تنہا تھیں، ماہر کچھ سن نہیں رہا تھا۔ پھر تمہارے لیے اسے یہی بہتر لگا۔'' مامی نے برہمی سے جتلایا۔

''امر نے ہی مجھے بتایا...... حورعین کی شادی کا...... حورعین کو بھی مجبور کیا...... وہ طلاق لے...... لیکن وہ طلاق کیوں لیتی، اس کے تو ارمان پورے ہو رہے تھے۔ اچھا ہوا مر کھپ گئی۔'' آخری الفاظ انتہائی صدمے کی کیفیت میں اس نے منہ ہی منہ کہے تھے۔ گو کہ حورعین اس کی رقیب تھی پھر اس کی وفات کا سن کر فاطمہ کو دکھ ضرور ہوا تھا لیکن اس وقت وہ جذباتی کیفیت میں تھی۔

''حورعین کو گئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا۔ اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔'' فاطمہ کو اچانک ایک اور شکوہ یاد آیا تھا۔ مامی کو چونکنا ہی پڑا۔ ان کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا تھا۔

''ڈیڑھ سال؟ تمہیں کس نے کہا؟'' مامی کی حیرانی پہ فاطمہ بھی چوکنا ہو گئی۔

''مجھے امر بھائی نے بتایا تھا۔''

''اوہو...... امر نے، اچھا، اچھا......'' مامی جیسے سمجھ گئی تھیں...... ''اور دیکھو...... یہ لڑکا دوبارہ آیا ہی نہیں...... بچی کی خبر گیری نہیں لی۔ بزنس بھی تو اس کا ملکوں، ملکوں پھیلا ہوا ہے...... بیچارے کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا...... یہ تو تمہاری وجہ سے نیو انگلینڈ کی مصروفیات ترک کر کے ائر پورٹ پہنچا تھا۔ پھر اسے ٹکٹ بھی کنفرم کروانا پڑا...... پاکستان کے لیے......

WWW.PAKSOCIETY.COM
PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اسے'' بھجوانا جو تھا......'' مامی بھی غیر رواں لہجے میں بولتی اسے کچھ عجیب سی لگیں۔ ان کی کوئی بات بھی اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔ جانے کسے ارجنٹ پاکستان بھجوانے کے لیے امر کو تردد کرنا پڑا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ پھر امر تو میڈیکل اسکول میں پڑھتا تھا۔ بزنس میں کیسے لگ گیا۔ خیر، بزنس تو اس کے باپ کا تھا۔ اور وہ ان کا اکلوتا بیٹا...... باپ کے بعد بزنس کو اسی نے سنبھالنا تھا...... کیونکہ امر امریکا کے کروڑ پتیوں میں شمار ہوتا تھا۔

''حورعین کو امر نے بھی بہت فورس کیا تھا...... وہ ماہر سے طلاق لے...... مگر وہ ایسی کٹھور تھی کہ میرا گھر اجاڑ ڈالا...... میں دس سال اپنے بچوں سے دور...... رہی۔'' اسے پھر سے وہی رونا یاد آ گیا۔

مامی اسے تاسف سے دیکھتی رہی تھیں جیسا کہ فاطمہ کا راگ انہیں کچھ بھا نہیں رہا تھا۔ خاص کر گھر اجاڑنے والی بات......

''اپنا کیا دھرا تمہیں بھول چکا ہے...... خیر یاد بھی نہیں کروانا چاہتی......'' مامی کو بلا کا غصہ آ گیا۔

''آپ بھی ہمیشہ مجھے الزام دیتی ہیں...... میں نے کیا گناہ کر دیا تھا؟'' وہ روہانسی ہو کر چیخ پڑی تھی۔

''تم نے حورعین اور ماہر کے نکاح کی خبر پولیس کو نہیں دی تھی؟'' انہوں نے انتہائی کرختگی سے فاطمہ کو حواس باختہ کر دیا...... یہ خاصا کربہہ سچ تھا۔ فاطمہ کا سر جھک گیا...... وہ قدرے شرمندہ ہو گئی لیکن وہ اپنے عمل میں خود کو حق بجانب سمجھتی تھی کہ اسے تب یہی کرنا چاہیے تھا اور اس نے ٹھیک کیا تھا۔

''تو میں اور کیا کرتی؟ مجھے اپنا گھر بچانا تھا۔'' اس نے پست آواز میں کہا۔

''گھر بچ گیا تھا کیا......؟ بلکہ تمہارا یہ عمل ماہر کو اور بھی تم سے متنفر کر گیا......'' مامی کو بھی بھگو بھگو کر مارنی آتی تھیں...... وہ پہلے بھی فاطمہ کو ہر وقت احساس دلاتی رہتی تھیں کہ وہ ماہر کی من چاہی بیوی نہیں ہے۔

''ماہر شروع سے ہی مجھے پسند نہیں کرتا تھا...... کیونکہ بیچ میں حورعین کھڑی تھی...... خالہ جتنی عظیم تھیں حورعین اتنی ہی پست......'' وہ گھٹی، گھٹی آواز میں بول رہی تھی۔

''اور اس نے بہت دفعہ مجھ سے کہا...... میں اس کی زندگی سے چلی جاؤں۔''

''وہ تمہارے ماموں کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا...... انہوں نے زبردستی تم سے ماہر کی شادی کروائی تھی۔'' مامی کو بھی نہ جانے کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا۔

''جانتی ہوں سب......'' فاطمہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا...... ''اسی لیے تو میں آتی نہیں تھی۔ ماہر خوش رہتا اپنی حورعین کے ساتھ...... اب بھی حورعین جاتی نہیں تو ماہر مجھے کبھی نہیں بلواتا...... بچے سنبھالنے مشکل جو ہو رہے تھے۔'' وہ زہر خندسی بولتی چلی گئی۔

''تم عقل سے خالی ہو......'' مامی نے ہمیشہ کی طرح بے رحمانہ تبصرہ کیا۔

''آپ جو بھی کہہ لیں اتنا تو تسلیم کریں گی ناں کہ حورعین نے آپ کے بگڑے ہوئے لختِ جگر کو سدھار دیا ہے۔ کہاں وہ چلانے والا...... میزیں الٹنے والا ماہر ارباب...... اور کہاں ایسی تہذیب کے گھر میں موجودگی کا بھی گمان نہیں ہو......'' وہ سبزی کاٹ چکی تو زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر جانے لگی...... معاً اس کی نگاہ سٹنگ روم کے ڈور فریم پر پڑی...... وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ سبزیوں کا پورا باؤل اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا...... وہ آنکھیں پھاڑے سامنے دیکھتی رہی تھی۔ اور فرش پر کٹی ہوئی گاجروں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا...... سدا کا چیختا چلاتا ماہر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا نہ جانے کب سٹنگ روم کے ڈور فریم میں کھڑا ہوا تھا...... اور جانے کب سے وہ ان کی باتیں سن رہا تھا؟ اور اس نے کیا کچھ نہیں سن لیا ہوگا؟ فاطمہ کا دماغ جیسے گول، گول گھومنے لگا...... مارے شرمندگی کے اس سے سر اٹھانا مشکل ہو گیا۔

☆☆☆

امر کا اس گھر میں قیام اور آمد و رفت لازم و ملزوم تھی۔

فاطمہ پچھلے سالوں پر نگاہ ڈالتی تو اسے ہر موڑ پر امر کی یادیں اس گھر میں بکھری نظر آتیں۔ وہ اپنے گھر میں کم، کم قیام کرتا تھا...... اس کا ہر وقت کا پڑاؤ اسی گھر میں تھا......

لیکن اب امر کو آئے ہوئے مہینہ بھر سے اوپر ہو گیا تھا۔ مامی ہر وقت امر پر غصہ کرتیں۔ ان کی ہر بات کا اختتام اس فقرے پر ہوتا۔

''بچی کی ذرا بھی پروا نہیں...... دونوں مصروف، دونوں آؤٹ آف اسٹیشن۔'' ان کا غصہ ناک کی نوک پر رہتا تھا اور حمنہ بھی پورے دن میں کئی مرتبہ پوچھتی......

''ڈیڈی! وہ لوگ کب آئیں گے؟'' کبھی کبھی جب وہ زیادہ اپ سیٹ ہوتی تو ماہر حمنہ کو لیے کمرے میں چلا جاتا...... جانے کون لوگ تھے جنہیں حمنہ مس کر رہی تھی اور کبھی، کبھی شدت سے کرنے لگتی...... تب ماہر آؤٹنگ کا لازمی پروگرام بنا لیتا تھا۔

ڈزنی لینڈ میں گزرا وہ دن بھی ایسا ہی بیکار سا تھا۔ فاطمہ کو بالکل ہی بیکار لگا...... ایسا دن جس میں ماہر بس حورعین کی بیٹی کے نخرے اٹھاتا رہا تھا۔ گو کہ عون اور محمد بھی بہت خوش تھے اور پورا دن ڈزنی لینڈ میں انجوائے کرتے رہے۔

''ڈیڈی کے ساتھ کبھی، کبھی اتنا انجوائے کرنے کا موقع ملتا ہے۔'' عون بہت خوش تھا...... ڈزنی لینڈ میں آ کر بھی خوش ہوتے ہیں ڈزنی لینڈ ایک جادو نگری ہے۔

فاطمہ نے اپنی پوری زندگی میں ڈزنی لینڈ کو نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ بہت غریب تھا اور ممی بس اتنا کماتی تھیں جس سے پیٹ کا سلسلہ چل سکتا۔ باقی عیاشیاں تو بس خواب اور خیال تھیں۔

ان کے مقابلے میں ممی کے رشتے دار بہت امیر تھے۔ ماموں کا اپنا بزنس اور گھر تھا۔ اور پاکستان والی خالہ بھی بہت امیر تھیں۔ بس انہی کے حالات بہت خراب تھے۔

آئندہ افطاری کے چند رہنما اصول یاد رکھیں

1۔ دستر خوان پر اس جگہ بیٹھیں جہاں آپ کا ہاتھ ہر چیز تک جا سکے۔

2۔ شربت کا جگ اپنے سامنے مگر تھوڑا سا دور رکھیں ورنہ سب آپ سے شربت مانگتے رہیں گے۔

3۔ دوسروں پر نظر رکھیں اور چیزوں پر بھی دیکھیں کون سی چیز جلد ختم ہو رہی ہے۔

4۔ ہر پانچ منٹ بعد تھوڑا سا شربت پی لیں تاکہ ٹھونسی ہوئی چیزیں نیچے ہو جائیں اور نعمتوں کی جگہ بن جائے۔

5۔ کھجور کی گٹھلیاں اپنے ساتھ والے کی پلیٹ میں ڈالتے جائیں تاکہ آپ کا دامن صاف رہے۔

نوٹ:

دستر خوان سے اٹھنے سے پہلے مکمل اطمینان کر لیں کہ کوئی چیز بچ تو نہیں گئی۔

خصوصی نوٹ...... اس سال ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ آئندہ بھی ہوں۔

از: مہ وش، سمرن راجپوت، سیالکوٹ

اظہارِ ہمدردی

ایک خاتون اپنی پڑوسن سے کہہ رہی تھیں۔

''اتنی دیر ہو گئی، منے کے ابا واپس نہیں آئے، ہو سکتا ہے کہ آج وہ پھر شراب خانے چلے گئے ہوں۔''

''اے ہے......! تم ہر بات کا برا پہلو ہی کیوں سوچتی ہو؟'' پڑوسن نے کہا، ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی بس کے نیچے آ گئے ہوں۔''

شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور اس وقت فاطمہ اپنی سابقہ زندگی کو سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ زندگی جو کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر تھی، وہ بڑے عرصے بعد فلوریڈا آئی تھی۔ قریب چودہ سال بعد...... یہ فلوریڈا تھا...... اس کا آبائی شہر...... جائے پیدائش...... لیکن فلوریڈا میں ابتدائی سولہ سال گزار کر بھی اس نے کبھی ڈزنی لینڈ کی سیر نہیں کی تھی۔ اسے ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کی بہت حسرت تھی۔ بہت شوق تھا ایسا ہی شوق جیسے پاکستان میں کسی بچے کو سفاری پارک دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ مگر فاطمہ کو تو جنونی شوق تھا۔ کیونکہ ڈزنی لینڈ ایک جادونگری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایسی جادونگری جس میں انسان کھو جائے، گم ہوجائے اور کبھی خود سے بھی نہ مل سکے۔ ڈزنی ورلڈ کو چھ حصوں میں اچھی طرح منظم بنایا گیا تھا۔ اس کا ماسٹر مائنڈ والٹ ڈزنی تھا...... جس کی ذہانت نے یہ منفرد اور اچھوتا جادو گھر بنایا تھا۔

کوئی بھی انسان اس کو دیکھ کر خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا...... جہاں جا کر تمام غم دنیا سے نجات مل جاتی...... وہ مین اسٹریٹ امریکا پر چلتی ہوئی بہت دور جارہی تھی۔

بچے پرانے فیشن کی اسٹیم انجن والی ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جو پوری جادونگری کے اردگرد چکراتی تھی۔ اس کے قریب سے ہاؤس بگھی گزر رہی تھی۔ بگھی کے آگے دو گھوڑے بندھے تھے۔ گھوڑے بہت خوب صورت تھے۔ جن کے بڑے، بڑے پاؤں ہوتے ہیں۔

مین اسٹریٹ کے آخری کارنر پر خوب صورت سنڈریلا کاسل جنہیں پریوں کا محل کہتے تھے۔ اس کی اٹھارہ منزلیں تھیں۔

اور بہت بچپن میں وہ سنڈریلا کاسل دیکھنے کی خواہش میں ممی کا سر کھاتی تھی۔ اس پر ضد اور ہٹ دھرمی سوار ہوجاتی۔ وہ روتی، چیختی اور پھر کونے میں گھس کر 'لاتعلق' ہوجاتی...... منظر سے غائب ہوجاتی۔ اس کی۔ بچپن سے یہی عادت تھی۔ وہ مقابل کی مجبوری کا سبب نہیں کھوجتی تھی۔ بس بدگمان ہو کر غائب ہوجاتی۔ منظر سے دور ہوجاتی اور تب تک اسی طرح رہتی جب تک اپنا دل واپسی کو نہ چاہتا۔

فاطمہ کو اچھی طرح یاد تھا۔ جب اس کی ماہر سے شادی ہوئی...... تب اس نے پہلی فرمائش میں ماہر سے کہا۔

''مجھے ڈزنی لینڈ دیکھنا ہے، مجھے سنڈریلا کاسل جانا ہے۔'' یہ فاطمہ کی بچپن سے دل میں دبی معصوم خواہش تھی اور اسے لگا یہ خواہش پوری کرنا ماہر کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ اس کے پاس وسائل بھی تھے۔ پیسہ بھی تھا اور وقت بھی...... لیکن ماہر اس کی فرمائش پر حیرت سے چیخ اٹھا تھا۔

''تم نے فلوریڈا میں رہ کر ڈزنی لینڈ نہیں دیکھا؟''

اس کی چیخ ایسی بھیانک نہیں تھی جس قدر اس کا رویہ ہتک آمیز تھا۔ ایک تو ماہر نے اس شادی کو قبول ہی نہیں کیا تھا...... وہ تو فاطمہ کو دیکھتا تک نہیں تھا۔ اوپر سے ایسی بے تکلفانہ فرمائش...... جیسے وہ دونوں بڑی محبت کرنے والے میاں بیوی ہوں۔ وہ تو اس کی دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ پھر اپنی مغرور ماں کے ساتھ مل کر اس کا مذاق اڑاتا رہا...... مامی بھی موقع کی تلاش میں تھیں۔ انہیں بھی فاطمہ پر طنز کے تیر برسانے کا موقع مل گیا تھا۔

''اس کا باپ اسے ٹافی تک لا کر نہیں دیتا تھا کجا کہ سیریں کراتا...... ملائکہ کو اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔''

مامی کو اس کی ممی پر بھی کیچڑ اچھالنے کا موقع مل گیا تھا۔

تب اس کا دل مامی سے کھٹا ہوا ہی تھا۔ ماہر سے بھی کھٹا ہوگیا تھا کیونکہ وہ بھی اس کی ممی پر الزام لگانے لگا۔

''یہ سب ملائکہ پھپھو کے اعمال کی سزا ہے۔ انسان کو اتنا بھی اپنے مقام سے گر نہیں جانا چاہیے کہ اسے اچھے، برے کی پہچان ہی نہیں رہے۔'' ماہر کی اس

بات پر فاطمہ خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ وہ غصے میں پھٹ پڑی تھی۔ اور اس نے ماہر کو بے نقط سنا ڈالی تھیں۔ اس بات کو قطعاً نظر انداز کر کے کہ وہ چار دن کی نو بیاہتا دلہن ہے۔ اس کی بکواس سن کر ماہر چیخ اٹھا تھا۔

''یہ ترس کے قابل نہیں تھی...... دیکھا آپ نے...... اس کی لمبی زبان کو...... میں تو کبھی اس سے شادی نہیں کرتا آپ نے میرے ساتھ بہت برا کیا ممی...... کتنی اجڈ اور جاہل ہے۔ اس میں بالکل تمیز نہیں......'' ماہر کا یہ غصہ پھر کم نہیں ہوا...... بلکہ وقت کے ساتھ، ساتھ بڑھتا رہا۔ اس دن کے بعد سے ماہر کو فاطمہ میں بس کیڑے ہی کیڑے دکھائی دینے لگے۔

وہ اس کی نظر میں جاہل تھی، ان پڑھ تھی، اجڈ تھی، کم عقل تھی۔

اس نے فلوریڈا میں پیدا ہو کر بھی گنوا دیا تھا...... اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ بات میں سلیقہ، نہ وقار، نہ ٹھہراؤ...... اسے تو بس ممی نے چوزوں کے دڑبے میں قید کر رکھا تھا تا کہ اسے امریکی معاشرے کی ہوا نہ لگے۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ فاطمہ کے بنیادی حقوق، تعلیم اور اعتماد کو نظر انداز کرتی رہی تھیں۔

مین اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے فلوریڈا کی یادوں نے اچانک اس پر حملہ کر دیا تھا پھر اسے وہ زندگی یاد آنے لگی جو اس نے ماہر کے ساتھ گزاری تھی۔

عون اور محمد کے بعد بھی وہ فیری لینڈ میں پرانی اسٹیم ٹرین جیسی زندگی گزارتی رہی تھی۔ جس میں بیٹھ کر انتہائی خوفناک سین دکھائی دیتے تھے۔

بظاہر اس کی زندگی ڈزنی لینڈ سے کم نہیں تھی۔ لیکن اس کے اندر آ کر پتا چلتا کہ وہ کتنا خوفناک وقت گزار رہی تھی۔

بچے ابھی تک قلعہ جات، ریچھ، جمبو دی ڈائمنڈ، ہارس شو اور شوٹنگ کرنے کا شوق پورا کر رہے تھے۔ ماہر اسے مین اسٹریٹ پر اندھا دھند چلتے دیکھ کر لبرٹی اسکوائر کی طرف لے آیا تھا۔ وہ جو...... اپنے دھیان میں مگن اور گم تھی۔ ماہر کے بازو کھینچنے پر بھی چونکی نہیں تھی

ماں کے نام

اپنی پلکوں پہ میرے اشک پرونے والی
مجھ سے بھی پہلے میرے درد پہ رونے والی
میری ہر سانس ہے مقروضِ محبت تیری
بوڑھے ہاتھوں سے میرے کپڑوں کو دھونے والی
مجھ کو احساسِ یتیمی سے بچائے رکھا
پھول ہی پھول میری راہوں میں بونے والی
مجھ کو جرموں کی تلافی کا بھی موقع نہ دیا
بے خیالی میں میرے ہاتھ سے کھونے والی
صبر اور شکر تیری عمر کا حاصل ٹھہرے
قلزمِ فقر میں تن من کو ڈبونے والی
روز روتی ہے میری تلخ مزاجی تجھ کو
میٹھی باتوں سے میرے دل کو بھگونے والی
کون راتوں کو میرے واسطے اب جاگے گا
تختِ فردوس پہ آرام سے سونے والی
ماں کو کھویا ہے تو یہ راز کھلا ہے دائم
ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے ہو کھلونے والی

شاعر: دائم بٹ

مرسلہ: یاسمین کنول، پسرور

نظم

کبھی مہندی سے سجا لو تم اپنے ہاتھوں کو
اس سجاوٹ کے کسی کونے میں
ہمارا بھی نام لکھ دو
یہ نام صرف ہم دونوں کو ہی نظر آئے
کچھ اس طرح سے ہم دونوں کا نام لکھ دو
تیری مہندی سے سجے ہاتھوں کو
میں اپنے ہاتھوں میں لوں گا
تیری مہندی کی خوشبو کو
اپنے دل میں قید کر لوں گا
ڈھونڈ لوں گا میں تیرے ہاتھوں میں
چھپے ہم دونوں کے نام

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بلکہ اس کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی آئی۔
پھر ایک راؤنڈ ٹیبل کے راؤنڈ اسٹول کو کھینچ کر ماہر نے اسے بیٹھنے کا کہا۔ اور پھر خود کو لمبا بار بر ہاؤس سے سمندری خوراک یعنی مچھلیوں کی ڈشز اٹھا لایا۔
پھر اس نے بچوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ بھوک سے ابھی کوسوں دور تھے۔ سو وہ گم صم سی فاطمہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
''تمہاری برسوں کی خواہش پوری ہو گئی......؟'' اس کا انداز طنزیہ نہیں تھا۔ پھر بھی فاطمہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ شاید ماہر کی بات کو سمجھنا چاہتی تھی۔
''برسوں کی خواہش؟'' اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔
''ہاں......ناں......ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کی خواہش......'' ماہر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی تھی۔ فاطمہ جان نہیں پائی تھی کیا یہ مسکراہٹ طنزیہ تھی؟ اور اس نے کتنی پرانی بات کا حوالہ دیا تھا۔ قریب چودہ سال پہلے فاطمہ کی وہ خواہش جو ماہر کے مذاق میں دب کر دم توڑ گئی تھی۔
''تم سنڈریلا کاسل نہیں دیکھو گی؟'' اس نے شرارتاً ہونٹ کا کونا دبا کر کہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو فاطمہ پھٹ پڑتی مگر اس وقت وہ فضول بحث میں اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''نہیں......'' اس نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔ ماہر ہنوز مسکراتا رہا...... جیسے اس کے نہیں کو انجوائے کر رہا ہو۔
''اگر کسی نے پوچھا تو بتا دینا......سنڈریلا کاسل میں بہترین ریستوران، اسنیک بار، کیفے، بیکریز، خوب صورت اسٹال، ہاؤس آف میجک جیولرز، بینک، فرسٹ ایڈ سینٹر موجود ہیں۔'' وہ کسی ٹورسٹ گائڈ کی طرح اسے بتا رہا تھا۔ فاطمہ کو بلا کا غصہ آیا مگر وہ پی گئی۔ اس وقت وہ کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتی تھی۔
''ویسے تم ڈزنی لینڈ میں ہنی مون منانا چاہتی تھیں ناں......؟ لیکن یہ جگہ تو بچوں کی انجوائے منٹ کے لیے ہے......تم ہنی مون کے لیے بش گارڈن کا انتخاب کرتیں۔ ویسے وقت اب بھی نہیں گزرا......اگر تم چاہو تو ہنی مون کا ایک سویٹ تیار ہو سکتا ہے۔'' ماہر جان بوجھ کر اسے تپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ وہ غصے میں کچھ تو بول اٹھے۔ لیکن فاطمہ فی الوقت ضبط سے کام لے رہی تھی۔
''تم کیا سوچ رہی ہو فاطمہ؟'' ماہر کو ذرا سنجیدہ ہونا ہی پڑا تھا۔ فاطمہ نے بھی ناپ تول کر اس کی ساری طراری نکالنے کا سوچا......اس نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔
''میں حورعین کو سوچ رہی ہوں۔''
''تم کبھی اپنے بارے میں بھی سوچ لیا کرو......کبھی اپنی غلطیوں پر بھی نظر ثانی کر لیا کرو......'' اس کی توقع کے عین مطابق ماہر چڑ گیا تھا۔ شاید وہ اس وقت حورعین کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیسا بے وفا تھا، ماہر......اتنی جلدی حورعین کو بھول بھی گیا۔ مرد ایسے ہی ہرجائی ہوتے ہیں۔ اس کے پاپا بھی ممی کو جلدی بھول گئے تھے۔ وہ ممی جنہوں نے پاپا کی خاطر ہر قسم کی صعوبتیں اٹھائی تھیں، مشکلات جھیلی تھیں۔
''ہر کوئی مجھے میری غلطیوں کا احساس دلاتا ہے۔ میں نے کون سا گناہ کر دیا تھا؟'' فاطمہ چیخ پڑی تھی۔ ماہر لمحے بھر کے لیے چپ کر گیا۔ اس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ وہ غیظ و غضب سے بھر گیا تھا۔ پھر وہ بڑے ہی ضبط کے ساتھ بولا۔
''تم اپنی یادداشت کھو چکی ہو...... یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں خود بھی اس شرمناک قصے کو دُہرانا نہیں چاہتا......بہتر ہے ہم کوئی اور بات کر لیں۔'' ماہر کا دوٹوک انداز اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گیا تھا۔ فاطمہ کا سر جھک گیا......اس کی یادداشت سلامت تھی......اور اسے وہ شرمناک قصہ بھی یاد تھا......مگر اس سب میں اس کا قصور کہاں نکلتا تھا۔

(جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں:۔
ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
ہر کتاب کا الگ سیکشن
ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
We Are Anti Waiting WebSite
واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں
WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan

fb.com/paksociety
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے دودھ ختم کرواور اپنی دادی کی دوائیں لے کر آؤ میڈیکل اسٹور سے...... رات سے ختم ہیں۔'' امی نے آدھا باقی رہ جانے والا دودھ کا مگ دوبارہ پورا بھر کے زیاد کے سامنے دھرا اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر ٹیبل پر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ گھر کے تمام افراد اسی چھوٹے سے کچن ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرتے تھے۔

''مجھے نہیں پینا دودھ، امی! خدا کا واسطہ ہے، اب آپ کی اولاد بڑی ہوگئی ہے۔ ناشتے میں تھوڑی سی ترمیم کردیں۔ چائے بنا کردیں مجھے......''

''زیاد بیٹا ہر بات کو انا کا مسئلہ مت بنالیا کرو۔ گھر میں اس طرح فساد پیدا ہوتا ہے، چلو شاباش ختم کرواب اسے۔'' امی نے رسان سے ایک بار پھر سمجھایا تھا۔ وہ اس کے غصے کو قابو کرنا جانتی تھیں۔

''امی! پروفیسر صاحب سے کہیں اپنے حکم میں تھوڑی تبدیلی لائیں۔ دودھ ناشتے کے بجائے رات سونے سے پہلے دے دیا کریں۔ کسی کو پتا چلتا ہے تو ہنستا ہے ہم پر کہ کالج، یونیورسٹی میں آکر بھی ہم ناشتے میں بچوں کی طرح دودھ لازمی پیتے ہیں۔'' زیاد سخت اپ سیٹ تھا اور امی اس کا سبب بھی جانتی تھیں۔ دودھ تو محض غصہ نکالنے کا بہانہ تھا۔ امی نے صبر کا گھونٹ بھرا اور تحمل سے گویا ہوئیں۔

''سب سے پہلی بات کہ میں نہیں سمجھتی کہ دودھ صرف بچوں کے پینے کی چیز ہے۔ تمہارے ابو کیا بچے ہیں؟ میں نے ساری عمر پروفیسر صاحب کو ناشتے میں دودھ پیتے دیکھا ہے۔'' امی نے لفظ پروفیسر صاحب پر زور دے کر کہا۔ ''اور دوسری بات...... پروفیسر صاحب تمہارے باپ ہیں اور باپ کو اس کے پیشے کے حساب سے نہیں، رشتے کے حساب سے بلایا جاتا ہے۔ سمجھے......'' امی نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی تھی۔ جبکہ زیاد کے چہرے کے تاثرات میں بیزاری مزید نمایاں ہوگئی۔

''زیاد......'' امی کو اس کے تاثرات سے دکھ پہنچا تھا۔

''ہوں......'' وہ مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتا کسی سوچ میں گم تھا۔

''بیٹا! ماں، باپ اولاد کا کبھی دانستہ برا نہیں کرتے...... نہ سوچتے ہیں...... ہاں یہ بات انہیں سمجھا نہیں سکتے۔ شعور کی طنابیں، وقت کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں، جو خود بخود عمر کے کسی حصے میں ان کے دماغ میں اتر جاتا ہے۔ تم سے صرف یہی کہوں گی کہ باپ کے لیے بدگمان ہونے کے بجائے انہیں سمجھو...... جس طرح بائیس سال انہوں نے تمہیں سمجھا ہے۔'' زیاد نے ایک نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا اور کرسی پیچھے کر کے کھڑا ہوگیا۔ کچن سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک نظر وہاں سے نظر آنے والے ''پروفیسر صاحب'' کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور صحن کے رخ کھلنے والے کچن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ امی نے دکھ اور تاسف سے دودھ سے بھرے مگ کو دیکھا جو جوں کا توں پڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''ٹھک، ٹھک، ٹھک......'' آدھا گھنٹا ہوگیا تھا زیاد کو اپنی بائیک کے ساتھ ''ٹھک، ٹھک'' اور خود سے ''بک بک'' کرتے ہوئے۔ قریب ہی کرسی پر براجمان دادی تسبیح کے دانے گراتی بغور پوتے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کی پنڈلیوں کا تیل سے مساج کرتی گھریلو ملازمہ زیاد کی چڑ چڑاہٹ کا لطف اٹھاتی وقفے، وقفے سے کھی کھی کرنے میں مصروف تھی۔ زیادہ کی برداشت جواب دے گئی۔

''اپنی کھی، کھی کنٹرول میں رکھ ثوبیہ......! نہیں تو تمہارے سر میں بھی دو پیچ ٹھونک دوں گا سمجھی......؟'' زیادہ نے اوزار کے ساتھ ملازمہ کو گھورکا۔

''اونہوں! زیاد لحاظ رکھو...... اور ثوبیہ تم بھی

اٹھو اب...... دیکھو جا کر تمہاری آپا کو کسی کام میں تمہاری ضرورت نہ ہو۔'' دادی اماں نے ملازمہ کو بہو کے پاس اندر روانہ کیا انہیں گھر کے مردوں کا ملازماؤں کے منہ لگنا قطعاً پسند نہیں تھا۔

''اور زیاد! تمہیں کاہے کا اتنا غصہ ہے جو اپنی بائیک کو آدھے گھنٹے سے مارے جارہے ہو۔ بس مارے جارہے ہو۔'' دادی اماں کا اشارہ زیادہ کی بائیک کی طرف تھا جس پر اپنا نہ جانے کون سا غصہ وہ نکال رہا تھا۔

''یہ اسی قابل ہے کہ اسے روز مارا جائے، سائیکل سے بدتر ہوچکی ہے، روز کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوا رہتا ہے اس کے ساتھ۔'' وہ سخت اکتایا ہوا تھا۔

''مسئلہ تمہارے دماغ کے ساتھ ہے، جو تمہیں یہ اچھی بھلی بائیک، سائیکل سے بدتر دکھ رہی ہے۔ ابھی ہفتہ پہلے تمہارا باپ تفصیلاً مکینک کو دکھا کر لایا ہے اور مکینک کے بقول تمہاری بائیک بالکل فٹ ہے۔ ہاں...... اگر تم یونہی اوزار لے کر اس کو ٹھوکتے رہے تو یقیناً ان فٹ ہوجائے گی۔ جیسا کہ تم چاہتے ہو۔'' دادی اماں نے چشمے کے اوپر سے دیکھتے ہوئے اسے بہت کچھ جتایا تھا۔ ان کی گفتگو ہمیشہ بڑی مدلل ہوتی تھی۔ اپنے وقت کی آٹھ جماعتیں پڑھ رکھی تھیں، پروفیسر کی ماں تھیں اور بزرگوں کی باتوں میں علم کے سمندر سے زیادہ تجربہ ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ زیاد ہمیشہ کی طرح جز بز ہوکر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اوزار فرش پر رکھتا دادی اماں کے پاس چلا آیا۔ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ دھر کر خود بھی وہیں ٹک گیا۔

''دادی اماں! پلیز آپ میری سفارش کردیں ناں...... دیکھیں آپ کے سامنے ہی تو ہے میری بائیک کی حالت......'' دادی اماں نے خشمگیں نظروں سے گھورا تھا۔

''اچھا، اچھا...... اچھی بھلی ہے میری بائیک......'' زیاد نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ہتھیار ڈالے تھے۔

''بس میرا شوق ہے ہیوی بائیک...... میرے دو دوستوں کے والد نے انہیں لے کر دی ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ حسن کے والد تو آسانی سے افورڈ بھی نہیں کرسکتے پھر بھی محض بیٹے کے شوق کی خاطر انہوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا اور ایک پروفیسر......'' زیاد نے زبان فوراً دانتوں تلے دبائی تھی۔ دادی اماں کے سامنے وہ باپ کو پروفیسر صاحب کہتا تو انہوں نے ایک زور کا دھر دینا تھا۔ ایسی زبان وہ صرف ماں کے سامنے ہی استعمال کرتا تھا۔

''میرا مطلب ہے آپ ابو سے کہیں ناں کہ مجھے بھی ہیوی بائیک لے دیں۔ وہ تو افورڈ بھی کرسکتے ہیں...... پلیز......! آپ کہیں ناں ان سے...... پتا نہیں ابو اپنے بچوں کی خواہشات کو ترجیح کیوں نہیں دیتے......؟ اوروں کے باپ بھی تو ہیں، اولاد کے منہ سے نکالنے سے پہلے چیز سامنے لا دھرتے ہیں لیکن ہمیں محض میانہ روی کا چورن چٹا دیتے ہیں۔ آخر ہماری بھی آرزوئیں ہیں، امنگیں ہیں۔'' اپنے تئیں زیاد نے دادی اماں کو جذباتی حوالے سے گھیرنے کی کوشش کی تھی مگر دادی اماں کے انداز و اطوار میں تبدیلی نظر نہیں آرہی تھی۔ چند لمحے پوتے کا چہرہ بغور جانچنے کے بعد وہ گویا ہوئیں۔

''زیاد میرے بچے......! تمہارے پیدا ہونے سے لے کر تمہارے جوان ہونے تک کوئی ایسا لمحہ مجھے یاد نہیں جب تمہارے باپ نے تمہاری بنیادی ضروریات سے نظر چرائی ہو۔ تمہاری بھوک میں تمہیں خوراک مہیا کی، تمہاری بیماری میں تمہارا علاج کرایا، تمہیں بہترین اوڑھایا، پہنایا...... نرم گرم بستر پر سلایا، سردی گرمی سے بچایا، جس کالج اور یونیورسٹی کا نام تم نے لیا، وہیں تمہیں پڑھایا، تمہاری ہی خواہش پر صرف ڈیڑھ سال پہلے تمہیں نئی بائیک لے کردی تھی حالانکہ گھر میں گاڑی کی سہولت پہلے سے ہی موجود تھی۔'' زیاد کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمایاں تھی مگر دادی اماں نے بات

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

جاری رکھی تھی۔ ”اور میرا خیال ہے کہ صرف چھ ماہ ہی ہوئے ہیں ناں تمہیں لیپ ٹاپ لے کر دیے ہوئے۔ تمہاری تین بہنوں کی تعلیم و تربیت اور پھر مناسب جہیز کے ساتھ بیاہ، میرا خیال ہے تمہارے باپ نے ہی کیے ہیں۔ پروفیسر درویش منش ضرور ہے مگر دنیا داری نبھانا جانتا ہے۔ اب اگر تمہاری ہیوی بائک کو فضول خرچ مان کر وہ دلانے سے انکار کر رہا ہے تو اس میں ایسا غلط بھی کچھ نہیں...... نہیں ہوں گے اس کے پاس اس قدر پیسے...... اپنے باپ کو سمجھو زیاد...... اسے آزماؤ مت......“ آخر میں دادی کا لہجہ بلاشبہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

”یہی تو...... یہی تو دادی اماں...... آخر کہاں جاتے ہیں پیسے......؟ میں نہیں مانتا کہ ابو کے پاس پیسے نہیں...... وہ میتھس، اسٹیٹس کے جانے مانے استاد ہیں، اکیڈمی بھی رن کر رہے ہیں پھر بھی آپ کہتی ہیں، پیسے نہیں...... چھوڑیں بھئی......“ زیاد نے تنفر سے سر جھٹکا اور دادی اماں کے دل کو جھٹکا لگا تھا۔ ان کے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ بت بنی زیاد کو پلٹ کر واپس جاتے اور بائیک کے پاس پڑے اوزار سمیٹتے دیکھتی رہی۔

اولاد ماں، باپ سے حساب کیوں مانگتی ہے؟ اور ماں باپ اسے صفائیاں کیوں دیتے ہیں؟ ساری عمر معاشی تگ و دو کی چکی کے پاٹوں میں پسنے کے بعد بھی اولاد کی تشنہ اور ان کہی خواہشات سالم پہاڑ کے مانند کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ ساری عمر جس اولاد کے لیے والدین اپنی ہستی مٹاتے رہتے ہیں، اولاد کی بن کہے جان جانے والے ماں، باپ جب بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے ان سے یہ گمان کرتے ہیں کہ آج بچے بن کہے والدین کے دل میں اتر جائیں، بن کہے جان جائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو اولاد ”بوڑھا، بچہ ایک برابر......“ کا ٹیگ لگا کر ماں باپ کو احتیاط سے ایک ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ جن ماں، باپ نے ہمیں بچے سے بڑا کیا وہ آج انہی کے لیے بچہ کیسے بن سکتے ہیں؟

☆☆☆

زیاد، پروفیسر محمود کا اکلوتا بیٹا اور تین بہنوں کا اکلوتا چھوٹا بھائی...... زیاد کے خیال میں وہ لاڈلا، اکلوتا، کبھی نہیں رہا۔ اور اس کی وجہ زیاد کے خیال میں خود اس کے والدِ محترم تھے۔ پروفیسر محمود اصول پرست اور سادہ طرزِ زندگی کے عادی ایک ایسی شخصیت، جن کے مداحوں میں ان کے اسٹوڈنٹس کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ اہلِ محلہ بھی شامل تھے۔ معلم کے طور پر قابلِ تحسین زندگی گزاری تھی۔ حلال کھایا تھا اور حلال کمایا تھا۔ بقول بیٹے کے بہت زیادہ کمایا تھا مگر کہاں ٹھکانے لگایا تھا یہ اس کی نظر میں باپ کی زندگی کا سربستہ راز تھا۔ اس کی اپنی نظر میں وہ خاصی مظلوم زندگی گزار رہا تھا جس میں اس کی ڈھیروں آرزوؤں کا خون ہو رہا تھا۔ بہت سی خواہشات مارنا پڑ رہی تھیں۔ زندگی کی ہر سانس پروفیسر صاحب کے حکم کے تابع تھی۔

”دودھ زندگی کا لازمی جزو، نہار منہ بادام ضرور کھانے ہیں، سونے سے پہلے چائے، کافی نہیں پینی؟ سردیوں میں ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ دودھ جلیبی لازمی کھانی ہے، رات نو بجے کے بعد گھر سے باہر رہنا ممنوع ہے، گھر میں چاہے ستر دوست بلوا لو مگر ہوٹلوں، کلبوں میں دوستوں کے ساتھ غل غپاڑا کرنا حرام، کمرے کا دروازہ بلاوجہ لاک نہیں کرنا اور باتھ روم میں نہانے میں پندرہ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہونے چاہئیں۔“ ان تمام احکامات کو مانتے زیاد، بچے سے جوان ہوا تھا پر اب وہ آزادی چاہتا تھا۔ وہ ناشتے میں دودھ کے بجائے ڈھیر ساری کافی حلق سے اتارنے کا خواہش مند تھا۔ باداموں سے اسے چڑ ہو گئی تھی۔ وہ کھلی پاکٹ منی کا خواہش مند تھا۔ زندگی ایک ڈھب پر گزارتے، عاجز آ چکا تھا۔ وہ پروفیسر صاحب کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اب بچہ نہیں رہا بلکہ ایم بی اے کے فائنل سمسٹر میں آ چکا ہے۔ اس کا حلقۂ احباب ہے...... وہ شہر کی ایک بہترین یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے (جو بقول اس کے پروفیسر صاحب نے محض دھاک بٹھانے کے لیے اس کا شہر کی بہترین یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا کر، اتنا خرچا کیا ہے) اب اگر وہ ایسی اونچی جگہ پر پڑھے گا تو رکھ رکھاؤ تو رکھنا پڑے گا ناں......

اور اس نے کوئی ایسی ہیوی ڈیمانڈ تو نہیں کی محض ”ہیوی بائیک“ ہی تو مانگی ہے مگر پروفیسر صاحب کا میانہ روی کا اصول ان کے آڑے آ رہا تھا جبکہ زیاد کے خیال میں اصل رکاوٹ ”بخل“ ہے، پروفیسر صاحب اپنی اولاد کے معاملے میں کنجوس ہیں، ٹھیک ہے اگر کچھ عرصہ پہلے ہی انہوں نے نئی بائیک دلائی تھی تو کیا ہوا......؟ کیا باپ ایک کے بعد دوسری چیز نہیں دلاتے......؟ اس کا اصل رونا ہی یہی تھا کہ پروفیسر صاحب پیسے کا کیا کرتے ہیں؟ ان کے ”سوشل اسٹیٹس“ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ پھوں پھاں کی عادت نہ ان میں تھی نہ امی میں...... گھر بھی سادگی اور سلیقہ مندی کا منہ بولتا ثبوت تھا تو پھر اس کا ”حق......“ پروفیسر صاحب کسے دیتے رہے ہیں جو اس کے لیے ان کے پاس محض ایک ہیوی بائیک کے لیے رقم نہیں...... کہاں جاتا ہے میرا حق......؟ اور زیاد... کو زیادہ دن تک یہ کھوج نہیں لگانی پڑی تھی۔

☆☆☆

موسم سرما عروج پر تھا۔ رات بھی شدید بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے ٹھنڈ میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ مگر صبح سورج نکلنے کی وجہ سے گھروں کے صحن پُر رونق ہو گئے تھے۔ اتوار کا دن تھا، اس لیے ہر گھر سے بچوں کی چہکار کی آواز آتی بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ پروفیسر صاحب بھی طبیعت میں گرانی کے کارن آج گھر میں موجود تھے۔ حالانکہ چھٹی کے دن وہ کبھی گھر میں نہیں ٹکتے تھے۔ ضرور کسی نہ کسی کے بلاوے پر گھر سے باہر ہوتے تھے۔ اس وقت وہ دھوپ کا لطف اٹھاتے تازہ اخبار کی سطر، سطر پڑھنے میں مصروف تھے۔ امی کچن میں ابو کی پسند کے پکوان بنانے میں لگی تھیں کہ کوئی تو دن ہوتا تھا جب شوہر سارا دن گھر میں موجود ہوتے تھے جبکہ دادی اماں حسبِ معمول ملازمہ سے پنڈلیوں کی مالش کروانے کے بعد وہیں صحن میں کرسی ڈالے معمول کی تسبیحات پڑھنے میں مصروف تھیں۔ زیاد تک سک سے تیار کمرے سے باہر آیا تھا۔ آج اس کا پروگرام اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی ہیوی بائیکس کو لانگ روٹ پر انجوائے کرنے کا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب کو صحن میں موجود پا کر ٹھٹک گیا تھا کیونکہ وہ یقیناً اس کی تیاری دیکھ کر ٹھٹک جاتے۔ دل میں ہزار بہانے تیار کرتا وہ دبے قدموں باہر آیا تھا۔ پروفیسر صاحب کا چہرہ پوری طرح سے اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا لہٰذا بنا چاپ کیے وہ صحن سے ملحق چھوٹی سی گلی میں کھڑی بائیک کو احتیاط سے گھسیٹ کر گلی کے آخری سرے پر بنے چھوٹے گیٹ سے باہر نکال لینا چاہتا تھا۔ پروفیسر صاحب کی پوچھ پڑتال سے بچ کر نکلنے کا یہ طریقہ خاصا احمقانہ تھا۔ روزانہ سیکڑوں طالب علموں کی چال سے ان کی شخصیت جانچ لینے والا معلم اپنی اولاد کے قدموں کی چاپ کیسے نہیں پرکھ سکتا......؟ زیاد نے بنا آواز کیے بائیک کو اسٹینڈ سے اتارا تھا اور چند قدموں کے فاصلے تک بائیک کو ابھی گھسیٹ پایا تھا کہ اس کے کانوں میں پروفیسر صاحب کی آواز آئی۔

”برخوردار......! سیانے کہتے ہیں کہ بائیک کو کک لگائی جائے تو وہ چلتی ہے، تم بھی ایسی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“ زیاد کا دل چاہا بائیک کو ایک زور دار دھکا دے اور صحن کی دیوار پر دے مارے مگر وہ ہمیشہ کی طرح بے بس تھا۔ اس نے پلٹ کر پروفیسر

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

صاحب کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی مگر آواز اخبار کے پیچھے سے آئی تھی۔ زیاد نے غور سے اخبار میں وہ سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش کی جس میں سے انہوں نے زیاد کو تاڑا تھا۔ دادی اماں جو بیٹھے، بیٹھے اونگھنے لگی تھیں، الرٹ ہو کر پوتے کی طرف متوجہ تھیں۔ اب جواب دینے کے بغیر چارہ نہیں تھا تبھی بولا۔

''وہ اصل میں ابو...... یونیورسٹی میں فائنل سمسٹر چل رہا ہے اس لیے اسائنمنٹس بنانے کے لیے سب دوست اکٹھے ہو رہے ہیں اور بائیک تو ویسے بھی دس منٹ لے ہی لیتی ہے، اسٹارٹ ہونے میں۔ بہت تنگ کرنے لگی ہے۔'' زیاد بوکھلا ضرور گیا تھا مگر بائیک کا خود ساختہ نقص بتانا نہیں بھولا تھا۔

''اچھا! لاؤ میں بھی تو دیکھوں ذرا......'' پروفیسر صاحب نے مصنوعی فکر مندی سے اخبار لپیٹا۔

''نہیں، نہیں ابو......اتنی بڑی پرابلم نہیں ہے۔ آپ بیٹھیں......'' زیاد نے فٹافٹ بائیک پر بیٹھ کر اسے کک لگائی تھی۔ پروفیسر صاحب کے بقول.... بیوقوفانہ طرزِ عمل اس پر ختم تھا۔ اب بھی اپنے عمل سے اپنے بیان کی نفی کر بیٹھا تھا۔

''ہوں......اچھا ہوا اسٹارٹ ہو گئی۔'' پروفیسر صاحب نے دوبارہ کرسی سے ٹیک لگائی اور بولے۔ ''نہیں تو مکینک کی خیر نہیں تھی برخوردار......! آخر پوری تسلی دی تھی اس نے بائیک کی حالت کے بارے میں۔''

دادی اماں نے باپ، بیٹے کی نوک جھوک پر بمشکل ہنسی دبائی تھی۔ زیاد جان چھڑاتا اسٹارٹ بائیک کو لے کر گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ گیٹ کی گھنٹی بج اٹھی......اس نے بائیک پر بیٹھے، بیٹھے دروازہ کھولا، قدوسی صاحب تھے، پروفیسر صاحب کے قریبی دوست......اس نے سلام کر کے انہیں اندر آنے کو کہا اور خود ان کے ذرا پہلو سے بائیک باہر لے جانے لگا تھا کہ قدوسی صاحب نے اسے روک لیا۔

''بیٹا! یہ رسید پروفیسر صاحب کو دے دو۔ ان سے کہنا کہ جن کو انہوں نے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے بھجوائے تھے، یہ ان کی طرف سے ہے۔ ابھی میں جلدی میں ہوں پھر کسی وقت آ کر تفصیلاً بات کروں گا...... ابھی چلتا ہوں......'' قدوسی صاحب ہوا کے جھونکے کی طرح آ کر چلے گئے۔ یہ جانے بغیر کہ زیاد کے دل میں لگی چنگاری کو ہوا دکھا گئے ہیں۔ ایک بیٹے کو باپ کے مقابل کھڑا کرنے کا سامان فراہم کر گئے ہیں۔ لمحوں میں زیاد کا دماغ سلگنے لگا تھا۔ اندرونی خلفشار اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ اس لیے کہ ابھی کل بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا تھا جب ایک دور پرے کی رشتے دار آ کر پروفیسر صاحب کی دریا دلی کے گن گا رہی تھیں اور اپنے کمرے میں موجود زیاد سب سن رہا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ بائیک کو مسلسل ریس دینے لگا تھا۔ اس کے بالکل پیچھے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے پروفیسر صاحب کا دل سکڑ کر پھیلا تھا، زبان جیسے خشک ہو کر تالو کو جا لگی تھی جو بھی تھا زیاد میں ان کی جان تھی مگر بلاشبہ وہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ ساری عمر نہ ڈرے تھے، نہ جھکے تھے۔

دادی اماں ساری صورتِ حال کی سنگینی جانچ کر زیاد کو آواز دے بیٹھیں۔ وہ نہیں چاہ رہی تھیں کہ اس وقت زیاد بائیک پر کہیں جائے...... جذباتی اور غصہ ور تو وہ شروع سے تھا۔ دادی اماں کی آواز سن کر زیاد نے لال بوٹی ہوتی آنکھوں سے پلٹ کر دیکھا تو نظر قریب کھڑے باپ کے مطمئن چہرے پر جا ٹکی۔ اور اگلے ہی لمحے رسید کی پرچی باپ کے پیروں میں پھینکتا وہ طوفان کی طرح بائیک نکال کر لے گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ پروفیسر صاحب نے وہ رسید یوں جھپٹ کر اٹھائی تھی جیسے وہ رسید نہیں کوئی قیمتی خزانہ ہو......

☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی۔ مغرب کی اذانیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ مگر اس گھر کا ایک بوڑھا، کمزور اور بیمار وجود جبکہ دو بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے نیم توانا نفوس صبح سے خالی پیٹ، صحن میں بیٹھے صرف جوان بیٹے کی راہ تک رہے تھے۔ امی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کو تکا جہاں پرندے گھروں کو اڑان بھر رہے تھے۔

''زیاد تو بھی گھر لوٹ آ......میرے بچے......''

ماں کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔ دادی اماں کا سردی کی شدت سے چٹختا بوڑھا چہرہ، جوان پوتے کے لیے فکر مند تھا تو نڈھال پروفیسر صاحب کا مضبوط دل بھی ہو چکا تھا۔ انہوں نے ماں کو بہت دفعہ اندر کمرے میں بھیجنے کی اور کچھ کھلانے کی کوشش کی مگر بے سود......لاکھ باشعور سہی...... مدلل طرزِ گفتگو رکھنے والی عورت سہی...... اندر سے وہ روایتی دادی اماں ہی تھیں......''اصل'' سے زیادہ انہیں بھی ''سود'' پیارا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کتنے لمحے سرکے تھے کہ زیاد کی مخصوص ڈپلیکیٹ چابی کی کھنک نے ان ...تینوں کو زندہ کر دیا تھا۔ گیٹ کھلا اور زیاد خاموشی سے بائیک گھسیٹتا اندر چلا آیا۔ ان تینوں نے بائیک کی بدتر حالت کو دیکھا مگر کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا...... جو چیخ، چیخ کر کسی شدید ایکسیڈنٹ کا پتا دے رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ جس جذباتی کشمکش کا شکار ہو کر زیاد گھر سے نکلا تھا اس میں، اس کا بخیریت گھر واپس آ جانا غنیمت تھا۔ پروفیسر صاحب کے لبوں کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا تھا، بائیک کی حالت دیکھ کر خود کلامی کی۔

''خبیث ! سچ میں بائیک ٹھوک آیا ہے، ناقابلِ استعمال بنانے کی ہر ممکن کوشش......'' بیٹے کو خیریت سے سامنے دیکھ کر دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دو چار تھپڑ بھی جڑ دیں۔ امی اور دادی اماں دونوں زیاد سے لپٹ، لپٹ جا رہی تھیں۔ دونوں ٹٹول، ٹٹول کر اس کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مبادا کہیں خود کو بھی چوٹ لگوا لایا ہو۔

سنو لڑکی

سنو لڑکی......!

زمانے کی طرح تم نے کسی کے خواب دیکھے ہیں
اگر خوابوں کی تعبیریں کہیں زندہ بھی رکھی ہیں
تو اپنے پیار کی خاطر
زمانے کو کبھی بھی درمیاں اپنے نہیں لانا
زمانہ تو کسی کیدو سے ہرگز کم نہیں جاناں
سنو لڑکی......

شاعرہ: فریدہ فری......لاہور

اصل جواب

ٹیچر: ''دو میں سے دو نکلے تو کیا بچا......؟''

اسٹوڈنٹ ''ہم کو سوال سمجھ نہیں آیا؟''

ٹیچر: ''تمہارے پاس دو روٹیاں تھیں تم نے ان کو کھا لیا اب تمہارے پاس کیا بچا؟''

اسٹوڈنٹ: ''سالن!''

از: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

ہنستے رہو

☆ چیونٹی رکشے میں بیٹھی اور پاؤں باہر رکھا۔

ڈرائیور: ''میم! پاؤں اندر کر لیجیے۔''

چیونٹی: ''نہیں راستے میں ہاتھی ملا تو لات مارنی ہے، کل منہ چڑا کر گیا تھا......''

☆☆☆

☆ لڑکی: ''آپ میری منگنی پر کیا تحفہ دیں گے؟''

سکھ: ''جو آپ کہو گی۔''

لڑکی: ''رنگ دے دینا۔''

سکھ: ''ٹھیک ہے پر اٹینڈ مت کرنا بیلنس کٹ جاتا ہے۔''

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اب بس بھی کریں آپ دونوں...... آپ کا بیٹا دنگل جیت کر نہیں آرہا بلکہ پورے شہر میں پھرتے آوارہ کتوں کی گنتی کر کے آرہے ہیں برخوردار...... دیکھ نہیں رہیں خود کی حالت کیسی ہورہی ہے؟ اور رہ گئی بائیک تو اس کا تیا پانچا آج نہیں تو کل لازمی تھا۔'' پروفیسر صاحب سارے دن کی کھولن اتارنا لازمی سمجھ رہے تھے جبکہ دادی اماں اور امی مسلسل انہیں آنکھ کے اشارے سے منع کر رہی تھیں۔ مگر پروفیسر صاحب مکمل فارم میں تھے۔

''کہاں تھے تم سارا دن......؟ گھر والوں کی فکر یا پروا بیچ کھائی ہے...... اور بائیک پر کیا ظلم ڈھایا ہے، ذرا یہ بھی بتادو......'' پروفیسر صاحب کو خاموش کھڑے زیاد کی خاموشی سے جھنجلاہٹ محسوس ہورہی تھی۔

وہ شعوری طور پر اسے بلوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ رسید والے واقعے کے حوالے سے زیاد کا ردِعمل جان لینا چاہتے تھے مگر وہ پروفیسر صاحب کے سوالات کے باوجود خاموش کھڑا کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے میں مصروف تھا۔ تبھی پروفیسر صاحب دھیرے، دھیرے چلتے بائیک کے پاس آئے اور جانچتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد بولے۔

''چلو تمہاری مرضی تو پوری ہوئی اب...... نئی بائیک کا سبب بنا ہی لیا آخر......'' پروفیسر صاحب کی زبان سے الفاظ کیا ادا ہوئے، زیاد کے تھکے ہوئے اعصاب پہ گویا ہنٹر برس گیا، وہ یک دم پھٹ پڑا تھا۔

''مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی...... پاس رکھیے آپ...... اپنے پیسے...... آپ کے خزانے میں کمی آجائے گی ورنہ...... آپ غیروں کو لاکھ دیجیے یا دو لاکھ...... مجھے پروا نہیں مگر اب مجھے آپ کے خزانے میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ جوڑ کر رکھیے، سنبھالیے اپنے خزانے کو سدا......''

''بکواس بند کرو زیاد......'' دادی اماں سے برداشت نہیں ہوسکا۔ تبھی تڑپ کر بولیں۔ ''کیا خزانہ، خزانہ لگا رکھی ہے؟ کون سی ایسی چیز ہے جو تم بچوں سے چھپا کر رکھی گئی ہے؟ کہاں گڑا دیکھ لیا تم نے ان دیکھا خزانہ......؟'' زیاد اس قدر متنفر ہوگا، کسی کو گمان تک نہیں تھا۔

''یہ تو پروفیسر صاحب کو پتا ہوگا ناں...... میں کیا جانوں......؟ مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ اوروں کے لیے ان کے پاس دینے کو لاکھ، لاکھ، ڈیڑھ، ڈیڑھ لاکھ کی رقم ہے، جو یہ خدا ترسی کرتے ہوئے دیے جارہے ہیں مگر اپنے سگے بیٹے کے لیے...... اپنے خزانے میں سے محض ایک ہیوی بائیک کے لیے بھی پیسے نہیں دے سکتے تو پھر مجھے بھی کوئی پروا نہیں...... ان کا خزانہ، انہی کو مبارک......! مگر مجھے ساری عمر یہ دکھ ضرور رہے گا کہ تمام عالم کو علم کی روشنی بانٹنے والا میرا باپ ''بخیل'' ہے۔''

''زیاد......'' امی اس درجہ گستاخی پہ ششدر رہ گئی تھیں اور ان کا ہاتھ تھپڑ مارنے کے لیے اوپر اٹھا تھا جسے نرمی سے پروفیسر صاحب نے تھام کر نیچے کردیا تھا۔

''مارلیں...... مارلیں کیا فرق پڑجائے گا......؟ کم از کم مارنے کے معاملے میں تو بخل سے کام نہ لیں۔'' زیاد استہزائیہ انداز میں کہتا ہوا کمرے کا رخ کرنے لگا، جب اسے اپنے پیچھے پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''زیاد! ذرا میرے کمرے میں چلو...... آج میں تمہیں اپنا پوشیدہ خزانہ دکھا دینا چاہتا ہوں...... چلو...'' پروفیسر صاحب نے قدم بڑھائے تھے۔ زیاد نے حیرت اور بے یقینی سے پروفیسر صاحب کو دیکھا اور پھر بولا۔

''سچ میں......؟ دیکھیں ابو مجھے آپ کی دولت جائداد کی ہوس نہیں...... مگر میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون سا ''خفیہ خزانہ'' ہے جو میں آپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی نہیں جانتا، جہاں سے دنیا بھر کی امداد کے لیے بڑی، بڑی رقمیں نکل آتی ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی زیاد کا لہجہ طنزیہ ہوگیا تھا اور کہیں دل میں شرمندگی کا احساس بھی جگہ بنا رہا تھا۔

''ہے...... واقعی ہے، ایسا خفیہ خزانہ ہے جو تمام کائنات کے خزانوں پر بھاری ہے مگر میں زندگی میں اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا یہاں تک کہ مجھے موت آجائے۔'' پروفیسر صاحب کے ٹھنڈے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا جس نے زیاد کے احساسات کو پل بھر کے لیے منجمد کردیا تھا۔

''اور میں......؟'' زیاد نے سینے پر انگلی رکھ کر باپ سے سوال کیا۔

''کیا میرے نفع کے لیے ہے وہ خزانہ......؟''

''نہیں، تم بھی اس سے زندگی میں نفع نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی موت آجائے......''

امی اور دادی اماں نے کلیجے تھامے تھے جبکہ زیاد کی آنکھیں شدت حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔

''اور یاد رکھو تم نے وہ خزانہ اگر اپنی اولاد کو منتقل کیا تو وہ بھی اس سے قبل از مرگ نفع نہیں اٹھا سکتی...... اب چلو میرے ساتھ کمرے میں، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ آپ دونوں خواتین یہیں رکیے......'' پروفیسر صاحب نے ماں اور بیوی کو مخاطب کیا۔ ''اور ایک باپ کے اپنی اولاد کے سامنے سرخرو ہونے کی دعا کیجیے گا۔'' آخری فقرہ کہتے، پروفیسر صاحب کا لہجہ بھرا گیا۔ زیاد، باپ کے قدم پہ قدم رکھتا ان کے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔

پروفیسر صاحب نے اسے دروازہ بند کرنے کو کہا اور خود دھیرے سے پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔

''میری الماری کا دایاں پٹ کھولو......'' پروفیسر صاحب نے دروازے پر جمے کھڑے زیاد کو کہا۔ ''اب نچلی دراز کو کھولو اور اس کے پچھلے خانے میں چھوٹا سا ڈبا رکھا ہے۔ اسے نکال لاؤ۔'' زیاد کسی معمول کی طرح پروفیسر صاحب کے کہے کے مطابق عمل کرتا ہوا دراز کھولنے لگا۔ دراز کے پچھلے خانے میں واقعی ایک چھوٹا سا خستہ حال لکڑی کا ڈبا پڑا تھا۔ زیاد نے اسے نکال کر ہاتھوں میں لیا اور پہلی سوچ اس کے دماغ میں جو آئی وہ یہ تھی۔

''اتنے چھوٹے ڈبے میں...... بڑا خزانہ......؟ شاید سونے کے بسکٹ......؟'' ایک میٹھی، میٹھی سی لہر زیاد کے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے زیاد کی شخصیت پر جو ٹیگ ہمیشہ نصب کیے رکھا تھا۔

''احمقانہ خیالات + احمقانہ حرکات = زیاد......'' وہ واقعتاً اس پر فٹ بیٹھتا تھا۔

''اسے میرے پاس لے آؤ۔'' نامعلوم ابھی کتنی دیر زیاد کا وجود میٹھی، میٹھی لہروں کے سپرد رہتا جبھی اسے پروفیسر صاحب نے پکار لیا۔ اس نے خاموشی سے پلٹ کر باکس باپ کے حوالے کیا اور خود قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پروفیسر صاحب چند لمحے گہری سوچتی نگاہوں سے اس باکس کو تکتے رہے۔ زیاد کو اس لمحے باپ کی آنکھوں میں واضح نمی دکھائی دی تھی پھر انہوں نے باکس کا چھوٹا ساختہ ہک ہٹا کر اس کا ڈھکن کھول دیا۔ زیاد نے خوشی اور تجسس کے تحت کچھ اچک کر اس باکس میں جھانکا اور پھر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس میں ڈھیروں کاغذ اور بوسیدہ رسیدوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف تو پرانی رسیدوں کا چھوٹا سا بنڈل پڑا تھا جو سارا کا سارا پیلا پڑ چکا تھا۔ پتا نہیں کس صدی کے کاغذ تھے۔ ان ان گنت چھوٹے کاغذوں اور رسیدوں میں زیاد کو کام کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ سخت مایوس ہوا تھا۔ اسے پروفیسر صاحب پر شدید غصہ آرہا تھا جو اسے بے وقوف بنا رہے تھے مگر ضبط کیے بیٹھا رہا اور پھر پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ان رسیدوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کے لیے تمہارا کوفت بھرا تجسس ختم

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل میں جاؤں گا۔'' زیاد نے فوراً چہرے کے تاثرات نارمل کیے پروفیسر صاحب باپ تھے، جان گئے تھے بیٹے کے جذبات......

''تمہارے دادا رحمت اللہ ٹھیٹ کاروباری آدمی تھے۔ صرف اپنے گھر والوں کی نظر میں اور انتہائی خدا ترس اور ہمدرد تھے دنیا کی نظر میں...... تمہاری طرح ہمیں بھی ان سے شکایتیں تھیں۔ پیسے کی کمی کی...... مانگیں پوری نہ کرنے کی...... عیش و عشرت کا سامان مہیا نہ کرنے کی...... ان کا کام محض گھر میں راشن ڈالنا اور بھول جانا تھا۔ اماں کو لگا بندھا پکڑاتے تھے اور پھر اماں ہوتیں اور ان کے رونے...... وہ کیسے ہم بہن بھائیوں کی ضرورتیں پوری کرتیں، کیسے فیسیں دیتیں۔ ابا جی کو کبھی سروکار نہیں تھا ان باتوں سے۔ بہت سے گلے شکوے دل میں لیے ہم بہن بھائی اپنے، اپنے ٹھکانے لگے اور ابا جی اپنے آخری ٹھکانے...... اور پھر جس دن وہ مرے اس دن ہم پر کھلا کہ ابا جی محض ہمیں یتیم نہیں کر گئے بلکہ ایک دنیا کو بے آسرا چھوڑ گئے۔ ان کی میت پر ان کی اولاد سے زیادہ رونے والے انجان لوگ تھے۔ جو روتے جاتے اور ہمیں بتاتے جاتے تھے کہ کس کے گھر کا چولھا ابا جی کے دم سے جلتا تھا۔ کس کی بیٹی ابا جی کی وجہ سے بیاہی گئی...... کس کو روزگار ابا جی نے دلایا۔ کسی کا کچھ اور کسی کا کچھ اور بہت سے لوگوں کا بہت کچھ ابا جی اپنے سنگ سمیٹ کر لے گئے۔

بہت دن بعد جب میں نے ابا جی کی دکان کھولی تو وہاں کسی کونے کھدرے سے مجھے یہ ڈبا ملا...... بالکل ایسا ہی تجسس میرے دل میں بھی جاگا تھا جیسا تمہارے دل میں ابھرا تھا۔ میں نے بھی یہی گمان کیا کہ میرے ہاتھ نہ جانے کیسا خزانہ لگنے والا ہے...... شکر تھا ابا جی کو ہمارا خیال تو آیا...... ساری عمر دوسروں کو بھرتے رہے اب مرنے کے بعد ہمیں بھی کچھ نواز ہی گئے۔

مگر جیسے ہی میں نے ڈبے کا ڈھکن ہٹایا......

ڈھیر سارے چھوٹے، چھوٹے کاغذ کے پُرزے میرا منہ چڑا رہے تھے...... بالکل ویسا ہی تاثر اور غصہ میرے دل میں بھی جاگا تھا جیسا ابھی میں نے تمہارے چہرے پر دیکھا تھا...... میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور ان کاغذ کے پُرزوں کو دیکھنے لگا۔ عجیب سی بات تھی...... ہر دوسرے پُرزے پر تقریباً ایک جیسی عبارت لکھی تھی۔

''لالہ رحمت اللہ...... دس روپے کی روٹی''

''لالہ رحمت اللہ...... پانچ روپے کی روٹی''

''لالہ رحمت اللہ...... سات روپے کی روٹی''

میں نے باقی کاغذوں کو بھی پھرول کے دیکھا جن میں سے کافی ساری تو رسیدیں تھیں اور کسی میں چھوٹی، چھوٹی سی لکھائی میں پیسوں کا حساب کتاب لکھا تھا۔ ابھی میں اسی ادھیڑبن میں لگا تھا کہ میرے دائیں ہاتھ میں پڑی چوکی پہ محمد دین چاچا آکر بیٹھ گئے۔ چاچا محمد دین ابا جی کے بہت قریبی یار دوستوں میں سے تھے۔ بالکل سامنے ہی ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ابا جی کی دکان کھلی دیکھی اور مجھے اس میں موجود پاکر اٹھ کر میرے پاس چلے آئے...... میں ان سے ملنے کے لیے اٹھنے لگا تو مجھے کندھے سے تھپک کر بٹھا دیا۔ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں...... شاید ابا جی کی یاد نے چٹکی لی تھی۔ دونوں کی بیٹھک بھی بڑی تھی ایک دوسرے کے ساتھ...... میرے ہاتھوں میں موجود ڈبے اور اس میں موجود کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھ میں مجھ سے پوچھنے لگے۔

''کیا دیکھ رہا ہے محمود پتر......؟ کیا ڈھونڈنا چاہ رہا ہے؟'' ان کی نظروں میں ناقابلِ فہم سا تاثر تھا۔ مجھے عجیب طرح کی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں چاچا جی...... وہ میں بس...... یونہی...... آج ویسے ہی دکان کھولنے کو جی کیا تو چلا آیا...... سوچا کہ......'' میں نے جواب دیا۔

''کیا سوچا......؟'' چاچا نے میری بات اچک لی۔

''یہی کہ تیرا باپ اس دکان میں تم لوگوں کے لیے کون سا خزانہ چھپا کر گیا ہے؟'' چاچا سر جھٹک کر دھیما سا ہنسے جبکہ میں شرم سے پسینے، پسینے ہوگیا۔

''شرم نہ کھا پتر...... آخر جو ہے تم سب کا ہی ہے۔ وارثت کے لیے شرم کیوں کھائی...... پر پتر ترکہ تو، تو ہاتھ میں تھام کر بیٹھا ہے۔'' چاچا نے میرا دھیان ڈبے کی طرف کرایا۔

''کیا...... یہ ڈبا......؟ ہمارا ترکہ......؟''

مجھے لگا چاچا دین محمد پگلا گیا ہے...... کیسی عجیب بات کر رہا تھا ناں......؟ بھلا کبھی کسی باپ نے اولاد کے لیے وراثت میں پرچیاں بھی چھوڑی ہوں گی......؟ مگر میں اپنے مرے باپ کے لیے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ مجھ میں برداشت اور تحمل بہت زیادہ تھا کہ ایک یہ واحد چیز تھی جو ہمارے باپ کی طرف سے ہم بچوں کو وافر ملنے والی سہولت تھی کیونکہ کسی بھی دکھ، درد، تنگی، ترشی میں اس خصوصیت کا موجود ہونا ہی کسی سہولت سے کم نہیں ہوتا......

''کیوں تاؤ کھا رہا ہے پتر......؟'' چاچا محمد دین کی آواز نے میرے خیالات کی ڈور کھینچی...... مجھے چاچا کے درست قیاس پہ حیرت بھی ہوئی۔ یہ پرانے وقتوں کے بابے، بابیاں (بوڑھے، بوڑھیاں) آپ کے کچھ نہ بھی لگتے ہوں تو پھر بھی آپ کی سوچیں سگے ماں، باپ کی طرح پڑھ لیتے ہیں۔ ''باپ پہ غصہ نہ کر...... تیرا باپ بڑا درویش آدمی تھا۔ تم لوگ جو بھی سمجھو...... پر دنیا جانتی ہے کہ وہ ننگے کو کپڑا اور بھوکے کو نوالہ دینے والوں میں سے تھا۔ یہ جو ڈبا تیرے ہاتھوں میں ہے ناں...... اگر تیری عقل سے پا جائے تو یہ سچ میں خزانہ ہے۔ اس ڈبے میں تیرے باپ کا کردار بند ہے۔ اس کی خدا ترسی، ہمدردی اور غریبوں کی دعائیں جمع ہوئی رکھی ہیں۔ سچ پوچھ تو اس میں لوگوں کی وہ گواہیاں بند ہیں جنہیں تیرے میرے جیسے فقیر روزِ قیامت اپنے نیک اعمال کا وزن زیادہ کرنے کو، حلق سے باہر زبانیں لٹکائے ڈھونڈتے پھریں گے۔ یہ جو تو پرچی دیکھ رہا ہے ناں......'' چاچا نے ہاتھ بڑھا کر وہی پرچی تھامی جس پر لکھا تھا۔

''لالہ رحمت اللہ، دس روپے کی روٹی......''

''یہ تیرے باپ کا روز کا کام تھا...... سامنے جو یونس ہوٹل ہے ناں...... اُدھر تیرے باپ نے کہہ رکھا تھا کہ دن بھر میں جو فقیر، غریب خواہ ضرورت مند یا ڈھونگی، لالہ رحمت اللہ کا نام لے کر روٹی مانگے تو اسے کبھی نہ مت کہنا۔ جتنا مرضی کھالے، کھانے دینا اور رات میں ایک ہی دفعہ حساب کی پرچی میری دکان پر پہنچا دینا...... یہ پرچیاں اسی کھاتے کی ہیں۔ روزانہ نہ جانے کتنے جھوٹے تو کتنے سچے آکر کھانا کھاتے اور تیرا باپ بل چکاتا۔ اصل میں جو بھی رحمت اللہ کی ہٹی پہ مانگنے آتا وہ اسے سامنے ہوٹل روانہ کر دیتا۔ دیکھا، دیکھی وہ لوگ بھی جانے لگے جنہیں تیرے باپ نے نہیں بھیجا ہوتا تھا۔ مگر پھر رحمت اللہ کو ساری دیہاڑی (دن) کی چاہے دس روپے کی روٹی پڑتی یا پندرہ کی...... اس کے متھے کبھی وٹ نہیں پڑا (اس زمانے میں دس روپے کی بھی اہمیت بہت زیادہ تھی) حاجی کرم دین کے پتر کو دکان تیرے پیو (باپ) نے ہی ڈال کر دی تھی۔ جس سے اس غریب کے بچے پلنے شروع ہوئے، کمہاروں کا منڈا دبئی کیسے پہنچ گیا......؟ تیرے باپ کے دیے ادھار سے، جو کبھی واپس نہیں ہوا۔ رحمت اللہ روز رات کو اپنا دیا ہوا معاف کر کے سونے والوں میں سے تھا۔

یہ جو ادریس ہے، پچھلی گلی میں جگی ڈال رکھی ہے جس نے...... وہ جب عیسائی سے مسلمان ہوا تو اسے کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ مسلمان اب بھی اس سے کھج (کراہیت) کھاتے اور عیسائی پوچھتا نہ تھا۔ تو تیرا باپ ہی تھا جس کی دکان سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ مرد بھی ناں......

تنگیِ نفس کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا کہ پولن الرجی نے شدید حملہ کر دیا تھا...... اور رات کے اس پہر میں بے بسی میں یوں سانس کیا لے رہی تھی لگتا تھا ابھی دم گھٹ جائے گا۔

شوہرِ نامدار اپنی اسٹڈی روم میں کانوں پر ہیڈ فون لگائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مطالعہ اور موسیقی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ گرتی پڑتی ان کے کمرے یں اشاروں سے اپنی حالتِ زار بتائی۔ میری طرف متوجہ ہوئے، ہیڈ فون اتار کر احوال پوچھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں! (یہ جملہ ان کا دل جلایا کرتا تھا) اگر ایمر جنسی میں جلدی نہ لے جایا گیا تو حالت بگڑ بھی سکتی تھی۔ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے، گاڑی نکالی اور مجھے ایمر جنسی سیکشن میں اسپتال لے گئے۔ راستہ بھر...... بولتے رہے، یہ بے وقت کیوں بیمار ہوئیں' یہ کون سا وقت ہے بے آرام کرنے کا...... میں ان کی عادت سے واقف تھی سنتی رہی ...... خیر اسپتال میں آلۂ بحالیِ تنفس میرا مطلب ہے آکسیجن سے میری بے ربط سانس بحال ہوئی اور قریباً ایک گھنٹے بعد میں پُر سکون سی ہو کر گھر آ کر سو گئی۔

شب و روز گزرتے رہے۔ ایک رات ٹھیک ایک بجے مجھے نیند سے جگایا اور کہا کہ میری طبیعت خراب ہے اسپتال جانا ہے۔ ہمارا ڈرائیور شام کو واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا...... سو میں نے اپنے بیگ میں کچھ رقم ڈالی اور انتہائی تیزی سے انہیں اسپتال لے آئی۔ ایمر جنسی میں بیٹھے ڈاکٹر اور عملے نے انہیں فوری امداد دی۔ لائف سیونگ انجکشن لگایا اور ایڈمٹ کر لیا کہ اب مریض آرام سے ہوگا۔ اگلے چند روز وہ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں تھے۔ اور ڈاکٹر مسلسل ان کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ اور میں کمرے کے باہر بیٹھی ان کی صحت یابی کے لیے دعاؤں میں مصروف تھی۔ بارہا یہی خیال آتا کہ انسان پہ یہ افتاد کسی بھی وقت آ سکتی ہے اب ان سے کیا کہتی کہ دن کی روشنی میں آپ کیوں بیمار نہ پڑے...... یہ کون سا وقت تھا مجھے بے آرام کرنے کا؟

بعد میں' میں سوچتی رہی کہ اس روز وہ سارا دن کیوں بے چین سے لان میں چہل قدمی کرتے رہے تھے کہ شاید انہی باتوں کی بازگشت پر غور کر رہے تھے......؟ ویسے عام حالات میں بے حد خیال اور محبت کرنے والے انسان تھے اور میں ان کو یہ بات یاد دلا کر خوب چھیڑ خانی کرتی صرف مسکراہٹیں ہوتیں چہرے پر......

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

اسے راشن پانی جاتا تھا۔ کون، کون سے بندے گنواؤں تجھے......؟ میں مانتا ہوں پتر کہ تم بچوں کے لیے تمہارا باپ کوئی لمبی چوڑی جائداد چھوڑ کر نہیں مرا...... مگر پتر اس غریب پرور کی مدد رب نے اس طرح کی کہ آج اس کی ساری اولاد کسی نہ کسی لائق ہو چکی ہے تو بھی بہت سا پڑھ گیا...... بہنیں تیری بیاہی گئیں۔ بھائی تیرا کمائی سے لگ گیا......

پتر محمود......! تیرے باپ نے یہ ڈبا دنیا دکھاوے کو نہیں بھرا...... وہ تو تاریکیوں میں گھروں کو راشن ڈھوتا تھا۔ یہ ڈبا وہ تم لوگوں کے لیے اس لیے چھوڑ گیا کہ شاید اس کی کسی اولاد کے ہاتھوں اس کے خزانے میں وادا (زیادتی) ہوتا رہے۔ اس نے ان اعمال کے اجر کے لیے دنیا میں آس نہیں لگائی تھی۔

وہ تو کہتا ہی اس کو "وڈے دن کا خزانہ......" (روزِ حشر کا خزانہ) تھا جو پتر ہر کوئی اکٹھا نہیں کر پاتا...... تیرے میرے جیسے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ بڑی، بڑی باتیں کرنے والوں کے کام بھی بڑے ہوں، یہ ضروری نہیں ہوتا کبھی کبھار بازی وہ لوگ مار لیتے ہیں جو کم فہم سمجھے جاتے ہیں۔ اب یہ تجھ پہ ہے کہ پتر کہ اپنے باپ کے لیے صدقۂ جاریہ بن جا اور ڈالتا رہ اس خزانے میں اعمال کے موتی اگر نہیں تو اٹھ اور سامنے والے نالے میں روڑ (بہا) آ...... تیرے باپ کی روح یقیناً سمجھ جائے گی کہ اس کی اولاد اس کا ترکہ سنبھال نہ سکی۔ اس کی چھوڑی جائداد نالے کے نذر ہوگئی......" چاچا محمد دین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کندھے پر پڑا صافہ اتار کر اپنی آنکھیں صاف کیں پھر کھڑے ہو کر میرا کندھا تھپک کر دکان پار کر گئے جبکہ میں وہیں پہ بیٹھا سود و زیاں کا حساب کرتا رہ گیا۔ کیا پایا تھا میں نے......؟

چوبیس سالہ زندگی میں...؟ کون سا دن ایسا تھا جو میں نے ابا جی کے ڈھب پر گزارا ہو؟ کس کی طرف سے مجھے کبھی کوئی رسید یا پرچی موصول ہوئی تھی؟

بس! وہ وقت مجھ پر ٹھہر گیا پھر میں نے ماضی دیکھا نہ مستقبل...... میں نے حال میں رہتے ہوئے آخرت کی فکر شروع کی...... رسیدیں اور پرچیاں اکٹھی کرنی شروع کیں۔ ابا جی کی طرح لوگوں کے گھروں میں راشن ڈالنے شروع کیے۔ بیروزگاروں کو کسی کام دھندے سے لگوایا...... کسی کی بیٹی کی شادی کا فرنیچر تو کسی کی بیٹی کی بارات کا کھانا، کسی غریب کی ٹپکتی چھت کو مرمت کروایا تو کسی کو علاج کی غرض سے رقم فراہم کی...... اور ان تمام کاموں کی رسیدیں وصول کیں...... اس لیے نہیں کہ کل کو میں مروں تو دنیا میرے لیے واہ، واہ کرے بلکہ اس لیے کہ جیسے میں نے ابا جی کے شروع کیے اس سلسلے کو آگے بڑھایا، ویسے ہی میری اولاد اس خزانے میں اپنا حصہ ڈال سکے لیکن......" پروفیسر صاحب نے جو بڑی دیر سے اپنی دُھن میں ماضی کی کھرچن، کھرچ رہے تھے لمحے بھر کو رکے اور بے جان بت کے مانند بیٹھے اپنے واحد اور جان سے عزیز بیٹے کو دیکھا۔

"لیکن ہم ایسے (خزانے) پائیں...... مرنے کے بعد...... یہاں تک کہ ہم حشر میں اٹھائیں جائیں گے۔ تب ہم اس خزانے کو پائیں گے اجر کی صورت' جزا کی صورت...... جنت کی صورت...... میں بخیل نہیں ہوں زیاد...... میں قطعاً بخیل نہیں ہوں، اللہ جانتا ہے میں نے اپنی اولاد کی خوراک، رہائش، پڑھائی، تربیت و پرورش میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں مجھ سے اس قدر گلے ہیں...... میں تمہیں اب بھی چھوٹے سے بچے کے مانند دیکھتا ہوں، اولاد کبھی ماں، باپ کے لیے بڑی نہیں ہوتی، میں تمہیں دودھ پلواتا ہوں کیونکہ میں اپنے بچے کے لیے اسے بہتر سمجھتا ہوں...... بادام کھلاتا ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میرے پڑھائی میں جتے بیٹے کے دماغ کو بادام تقویت دیں گے......

PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

میں تمہیں دس بجے کے بعد گھر سے باہر نہیں جانے دیتا ہوں کہ دل سوکھے پتے کے مانند تھر تھراتا ہے جب میرا بچہ رات گئے تک باہر رہتا ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ میرا لائق بچہ شہر کے بہترین کالج اور یونیورسٹی کے قابل ہے سو میں نے اس کا ایڈمیشن وہیں کرایا اور...... اور مجھے لگتا ہے کہ میرا بیٹا ہیوی بائک کے قابل نہیں ہے وہ اس پر بیٹھ کر ہوا سے باتیں کرے گا، وہ اس پر سوار ہو کر بے پروا ہو سکتا ہے، وہ بھول سکتا ہے کہ اس کی ریش رائڈنگ خدانخواستہ اسے کسی نقصان سے دوچار کر سکتی ہے بس...... اتنا سا قصہ ہے میرے بیٹے......''

پروفیسر صاحب بات مکمل کر کے آنکھیں موندے گہری، گہری سانس لینے لگے...... تھکن جیسے رگ، رگ میں سرایت کر گئی تھی۔

''میں کنجوس نہیں ہوں، میں اپنی آخرت کے لیے ڈر چکا ہوں، تمہارے تو آگے لمبی زندگی پڑی ہے انشاء اللہ...... مگر میرے بچے...... میرا توشہ خالی ہے...... مجھے اپنی خالی جھولی کو اس خزانے سے بھرنے دو...... خدا کا واسطہ ہے تمہیں...... میں اور کتنا جیوں گا ...... سب تمہارا ہی ہے مگر زیاد...... میرے بچے...... مجھے خالی ہاتھ مت جانے دو، مجھے اکٹھا کر لینے دو......''

اتنا کہہ کر پروفیسر صاحب بچوں کے مانند رو دیے۔ انہوں نے بیٹے کے سامنے اپنی پیٹھ ننگی کی تھی۔ وہ دکھ کی اتھا گہرائیوں میں ڈوب گئے تھے۔ انہیں خبر تک نہیں تھی کہ زیاد پہ کیا بیت گئی۔ وہ شدید سردی میں پسینے میں ڈوبا گہری، گہری سانس کھینچ رہا تھا۔

☆☆☆

''اُف...... ! پشیمانی سی پشیمانی تھی...... کیا سمجھتا رہا وہ اپنے باپ کو اور وہ کیا نکلے...... کیا وہ ایسے دادا کا پوتا یا ایسے باپ کا بیٹا کہلانے کا مستحق تھا؟ میں اپنے دھندوں میں الجھا رہا اور میرا باپ اپنے اور میرے لیے آخرت کا سامان کرنے میں لگا رہا اور اگر اب بھی میں اللہ کی رسی کو تھام نہ پاتا تو......؟'' زیاد کا پسینے، پسینے ہوا جسم زوردار جھٹکا کھا گیا اور اس جھٹکے کے نتیجے میں وہ پروفیسر صاحب کے قدموں میں پڑا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں ابو......! میں بد بخت ہوں، کم ظرف ہوں، میں باپ کو آزمانے چلا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ میری خود کی زندگی آزمائش بن جاتی تو......؟ میں آپ سے بدتمیزی کرتا رہا۔ آپ کو بخیل اور کنجوس سمجھتا رہا...... میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کے اعمال روزِ حشر مجھے بھی خاک سے لاکھ کا کر دیں گے...... جو میں آپ کے قدم پہ قدم رکھ لوں...... مجھے معاف کر دیں ابو...... پلیز......'' زیاد رو رہا تھا اور زیاد کے رونے سے پروفیسر صاحب کا دل رو رہا تھا۔ انہوں نے جھک کر پیروں پہ گرے بیٹے کو اٹھایا، اس کی پیشانی چومی...... پھر بولے۔

''میں نے تمہیں معاف کیا...... ہمارا رب بھی ہمیں معاف کرے...... آج میں بہت آسودہ حال ہو گیا ہوں۔ میرا بیٹا، میرے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔ تم نے مجھے خوشیوں سے بھر دیا ہے اور باپ کو خوش کر کے اپنے خزانے کو نیکیوں سے......'' آخری جملہ کہتے ہوئے پروفیسر صاحب کا لہجہ ہلکا سا شرارتی ہوا تھا۔

''اب میں باہر جاتا ہوں ابو......! دادی اماں اور امی سخت پریشان ہوں گی......'' زیاد تیزی سے اٹھا اور باہر نکلنے کے لیے قدم دروازے کی سمت بڑھا دیے۔

''زیاد......؟'' عین اسی وقت پروفیسر صاحب نے پیچھے سے پکارا۔

''جی ابو......'' وہ پلٹا۔

''مجھے اچھا لگتا ہے، جب تم مجھے وہ کہتے ہو۔''

''وہ کیا ابو......؟''

''پروفیسر صاحب......'' اور پروفیسر صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ان کے خوب صورت قہقہے میں زیاد کی چہکار بھی شامل تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں :۔

✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
✧ مشہور مصنفین کی گتب کی مکمل رینج
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY